تقلید

کی شرعی حیثیت

شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

مکتبہ دارالعلوم کراچی

طبع جدید .... رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ بمطابق نومبر ۲۰۰۴ء

باہتمام .... محمد قاسم کلکتی

ناشر

مکتبہ دارالعلوم کراچی

☎ 5042280-5049774-6

﴿ ملنے کے پتے ﴾

ادارۃ المعارف ... احاطہ دارالعلوم کراچی

دارالاشاعت ... اردو بازار کراچی

ادارہ اسلامیات ... اردو بازار کراچی

بیت القرآن ... اردو بازار کراچی

بیت الکتب ... گلشن اقبال کراچی

ادارہ اسلامیات -- ۱۹۰ انارکلی لاہور

فہرست مضامین
"تقلید کی شرعی حیثیت"

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
حرفِ آغاز	۴	تیسرا درجہ، مجتہد فی المذہب کی تقلید	۱۰۸
حقیقتِ تقلید	۷	چوتھا درجہ، مجتہد مطلق کی تقلید	۱۰۹
قرآن کریم اور تقلید	۱۶	تقلید پر شبہات واعتراضات	۱۱۵
تقلید اور حدیث	۲۵	قرآن میں آباء واجداد کی تقلید	״
عہدِ صحابہؓ اور تقلیدِ مطلق	۳۳	احبار ورہبان کی تقلید	۱۱۷
تقلیدِ شخصی عہدِ صحابہؓ وتابعینؒ میں	۴۳	حضرت عدی بن حاتمؓ کی حدیث	۱۲۳
پہلی نظیر	״	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد	۱۲۶
دوسری نظیر	۴۷	ائمہ مجتہدین کے ارشادات	۱۲۷
تیسری نظیر	۴۹	عام آدمی مجتہد کو کیسے پہچانے؟	۱۳۳
چوتھی نظیر	۵۵	کیا تقلید کوئی عیب ہے؟	۱۳۵
چند متفرق نظیریں	۵۶	تقلیدِ شخصی اور خواہش پرستی	۱۳۹
تقلیدِ شخصی کی ضرورت	۶۰	تقلید اور نئے پیش آمدہ مسائل	۱۴۰
تقلیدِ شخصی کو واضح کرنے کی ایک واضح نظیر	۷۵	حنفی مسلک اور عمل بالحدیث	۱۴۲
مذاہبِ اربعہ کی تخصیص	۷۸	امام ابوحنیفہؒ اور علم حدیث	۱۵۱
تقلید کے مختلف درجات	۸۵	تقلید میں جمود	۱۵۶
۱۔ عوام کی تقلید	״	آخری گزارش	۱۵۸
دوسرا درجہ، متبحر عالم کی تقلید	۹۴	تمت	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

حرفِ آغاز

"تقلید و اجتہاد" کے مسئلے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور مجھے یہ تصور بھی نہیں تھا کہ میں اس موضوع کی کتابوں میں کوئی اضافہ کر سکوں گا، لیکن اس مقالے کی تالیف کے اسباب قدرتی طور پر خود بخود جمع ہو گئے،

۱۹۶۳ء میں ماہنامہ فاران کراچی کے مدیر جناب ماہر القادری نے ایک وقتی ضرورت کے پیشِ نظر مجھ سے "تقلید" کے مسئلے پر ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی، احقر کو اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کے طرز کے مطابق ان مسائل پر بحث و مناظرہ میں شامل ہونا پسند نہ تھا، لیکن یہ سوچ کر ایک مختصر مضمون لکھ دیا کہ اس میں مسئلے کی حقیقت آسان انداز میں واضح کر دی جائے، اور جو حضرات اس مسئلے میں مسلمانوں کے اختلافات کو ہوا دے کر ایک دوسرے کو کافر و مشرک قرار دے رہے ہیں، انھیں دعوتِ فکر دی جائے،

یہ مضمون مئی ۱۹۶۳ء کے فاران میں شائع ہوا تو اسے اصحابِ فکر نے بحمد اللہ غیر معمولی طور پر پسند کیا، اور وہ پاک و ہند کے متعدد جرائد میں نقل کیا گیا، بلکہ جو ناگڈھ

ے کچھ مسلمانوں نے اسے مستقل رسالے کی شکل میں بھی شائع کر دیا،

دوسری طرف ہر چند کہ اس مضمون کا انداز بحث و مناظرے سے کوسوں دور تھا لیکن جو حضرات ائمہ مجتہدین کی تقلید کے خلاف ہیں اُن کی طرف سے اس پر متعدد تنقیدیں بھی لکھی گئیں، ان میں سے ایک تنقید تو حضرت مولانا محمد اسمٰعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمائی، جو پہلے ہفت روزہ الاعتصام کی تیرہ قسطوں میں شائع ہوئی، پھر اُن کی کتاب "تحریک آزادیٔ فکر اور شاہ ولی اللہؒ کی تجدیدی مساعی" کا ایک حصہ بن گئی،

دوسرا جواب "التحقیق فی جواب التقلید" کے نام سے کراچی سے شائع ہوا، یہ ایک ایسے صاحب کی تالیف ہے جو ائمہ مجتہدین کو کھلم کھلا شریعت ساز، اُن کے مقلدوں کو کافر و مشرک اور فقہ اسلامی کو خود ساختہ قرار دیتے ہیں، ایک تیسرا تبصرہ حیدر آباد دکن کے ایک ماہنامے (غالباً البیان) میں بھی لکھا گیا،

لیکن چونکہ احقر کا مقصد بحث و مناظرہ تھا ہی نہیں، اس لئے احقر نے اس سلسلے کو مزید دراز کرنا مناسب نہ سمجھا، اور تیرہ سال تک اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا

مگر چونکہ "تقلید" پر احقر کا وہ مضمون بہت سے اہلِ فکر کی نظر سے گزرا تھا، اور احباب کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی طرح اسے یہاں ... بھی الگ شائع کیا جائے، اس لئے حال ہی میں اسے شائع کرنے کا ارادہ کر لیا، اس وقت میں نے مناسب سمجھا کہ اس پر نظر ثانی کر لی جائے، اور اُس پر جو تبصرے لکھے گئے ہیں انھیں بھی سامنے رکھا جائے، اب جو نظر ثانی شروع کی تو یہ ایک مستقل کتاب بن گئی، جو آپ کے سامنے ہے، اس میں مسئلے کی مزید تحقیق و تفصیل بھی آگئی ہے، اور مذکورہ تنقیدوں میں جو واقعی علمی اشکالات احقر کے مضمون پر وارد کئے گئے تھے اُن کا حل بھی آگیا ہے، اگرچہ سوال و جواب کا مناظرانہ طرز احقر کو پسند نہیں، اس لئے معدودے چند مقامات کے علاوہ کسی کا نام لئے بغیر ان اشکالات کا حل بھی کتاب کے عمومی مباحث میں مثبت طور پر شامل کر دیا ہے،

یہ وضاحت اب بھی ضروری ہے کہ یہ کوئی بحث و مناظرہ کی کتاب نہیں بلکہ

یہ مسئلہ تقلید کی علمی تحقیق ہے، اور اس کا مقصد امت مسلمہ کی اس عظیم اکثریت کا موقف واضح کرنا ہے جو تقریباً ہر دور میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کرتی آئی ہے، نیز تقلید کے مسئلے میں افراط و تفریط سے ہٹ کر اس راہِ اعتدال کی نشاندہی کرنا مقصود ہے جس پر اہلِ سنت علماء کی بھاری اکثریت گامزن رہی ہے، لہٰذا اس کو بحث و مناظرہ کے جذبہ سے نہیں بلکہ علمی حیثیت ہی میں دیکھا اور پڑھا جائے۔

"تقلید" کے خلاف پروپیگنڈا آجکل متجددین اور اباحیت پسندوں کی طرف سے بھی شدّومد کے ساتھ ہو رہا ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ یہ رسالہ اُن شبہات کو دُور کرنے میں بھی معاون ہو گا۔

اللہ تعالیٰ سے دُعاء ہے کہ وہ اس ناچیز کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے، اور یہ مسلمانوں کے لئے نافع اور مفید ثابت ہو، آمین۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ۔

احقر
محمد تقی عثمانی
خادم دار العلوم کراچی ۱۴
لیلۃ الجمعہ ۴ رجادی الثانیہ ۱۳۹۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

حقیقتِ تقلید

اس بات سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا کہ دین کی اصل دعوت یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی اس لئے واجب ہے کہ حضورؐ نے اپنے قول وفعل سے احکامِ الٰہی کی ترجمانی فرمائی ہے، کونسی چیز حلال ہے؟ کونسی چیز حرام؟ کیا جائز ہے؟ کیا ناجائز؟ ان تمام معاملات میں خالصۃً اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرنی ہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کے بجائے کسی اور کی اطاعت کرنے کا قائل ہو اور اس کو مستقل بالذات مُطاع سمجھتا ہو وہ یقیناً دائرۂ اسلام سے خارج ہے، لہٰذا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن وسنت کے احکام کی اطاعت کرے،

لیکن قرآن وسنّت میں بعض احکام تو ایسے ہیں کہ جنھیں ہر معمولی لکھا پڑھا آدمی سمجھ سکتا ہے، ان میں کوئی اجمال، ابہام یا تعارض نہیں ہے، بلکہ جو شخص بھی انھیں پڑھے گا وہ کسی الجھن کے بغیر ان کا مطلب سمجھ لے گا، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

لَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا (الحجرات)

"تم میں سے کوئی کسی کو پیٹھ پیچھے بُرا نہ کہے "

جو شخص بھی عربی زبان جانتا ہو وہ اس ارشاد کے معنی سمجھ جائے گا، اور چونکہ نہ اس میں کوئی ابہام ہے اور نہ کوئی دوسری شرعی دلیل اس سے ٹکراتی ہے، اس لئے اس میں کوئی الجھن پیش نہیں آئے گی، یا مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ

"کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں"

یہ ارشاد بھی بالکل واضح ہے، اس میں کوئی پیچیدگی اور اشتباہ نہیں، ہر عربی داں بلا تکلف اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے،

اس کے برعکس قرآن وسنت کے بہت سے احکام وہ ہیں جن میں کوئی ابہام یا اجمال پایا جاتا ہے، اور کچھ ایسے بھی ہیں جو قرآن ہی کی کسی دوسری آیت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی کسی دوسری حدیث سے متعارض معلوم ہوتے ہیں، ہر ایک کی مثال ملاحظہ فرمائیے :-

(۱) قرآن کریم کا ارشاد :- وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ،

"اور جن عورتوں کو طلاق دیدی گئی ہو وہ تین "قرء" گذرنے تک انتظار کریں گی "

اس آیت میں مطلقہ عورت کی عدت بیان کی گئی ہے، اور اس کے لئے "تین قرء" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن "قرء" کا لفظ عربی زبان میں "حیض" (ماہواری) کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور "طہر" (پاکی) کے لئے بھی، اگر پہلے معنی لئے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مطلقہ کی عدت تین مرتبہ ایام ماہواری کا گزر جانا ہے، اور اگر دوسرے معنی لئے جائیں تو تین طہر گزرنے سے عدت پوری ہوگی، اس موقع پر ہمارے لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سے معنی پر عمل کریں؟

(۲) ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

من لم یترك المخابرة فلیؤذن بحرب

من اللہ ورسولہ (ابوداؤد)

جو شخص بٹائی کا کاروبار نہ چھوڑے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی
طرف سے اعلانِ جنگ سن لے ''

اس حدیث میں بٹائی کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن بٹائی کی بہت سی صورتیں ہیں، یہ حدیث اس بارے میں خاموش ہے کہ یہاں بٹائی کی کونسی صورت مراد ہے؟ کیا بٹائی کی ہر صورت ناجائز ہوگی؟ یا بعض صورتیں جائز قرار پائیں گی، اور بعض ناجائز؟ حدیث میں ایک قسم کا اجمال پایا جارہا ہے، جس کی وجہ سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بٹائی کو علی الاطلاق ناجائز کہدیں؟ یا اس میں کوئی تفصیل یا تقسیم ہے؟

(۳) ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ،

جس شخص کا کوئی امام ہو تو امام کی قرات اس کیلئے بھی قرات بن جائے گی''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں جب امام قرارت کر رہا ہو تو مقتدی کو خاموش کھڑا رہنا چاہئے، دوسری طرف آپ ہی کا ارشاد ہے:۔

لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ (بخاری)

جس شخص نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہوگی ''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے، ان دونوں حدیثوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پہلی حدیث کو اصل قرار دے کر یوں کہا جائے کہ دوسری حدیث میں صرف امام اور منفرد کو خطاب کیا گیا ہے اور مقتدی اس سے مستثنیٰ ہے، یا دوسری حدیث کو اصل قرار دے کر یوں کہا جائے کہ پہلی حدیث میں قرارت سے مراد سورۂ فاتحہ کے سوا کوئی دوسری سورۃ ہے اور سورۂ فاتحہ اس سے مستثنیٰ ہے؟

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قرآن وحدیث سے احکام کے مستنبط کرنے میں اس قسم کی بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں، اب ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنی فہم و

بصیرت پر اعتماد کر کے اس قسم کے معاملات میں خود کوئی فیصلہ کرلیں اور اس پر عمل کریں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں از خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے یہ دیکھیں کہ قرآن و سنت کے ان ارشادات سے ہمارے جلیل القدر اسلاف نے کیا سمجھا ہے؟ چنانچہ قرونِ اُولیٰ کے جن بزرگوں کو ہم علوم قرآن و سنت کا زیادہ ماہر پائیں، ان کی فہم و بصیرت پر اعتماد کریں، اور انھوں نے جو کچھ سمجھا ہے اس کے مطابق عمل کریں،

اگر انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو ہمارے خیال کے مطابق اس بات میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت خاصی خطرناک ہے، اور دوسری صورت بہت محتاط، یہ صرف تواضع اور کسرِ نفسی ہی نہیں، ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، کہ علم و فہم، ذکاوت و حافظہ، دین و دیانت، تقویٰ اور پرہیزگاری، ہر اعتبار سے ہم اس قدر تہی دست ہیں کہ قرونِ اُولیٰ کے علماء سے ہمیں کوئی نسبت نہیں، پھر جس مبارک ماحول میں قرآن کریم نازل ہوا تھا قرونِ اُولیٰ کے علماء اس سے بھی قریب ہیں، اور اس قرب کی بناء پر اُن کے لئے قرآن و سنت کی مراد کو سمجھنا زیادہ آسان ہے، اس کے برخلاف ہم عہدِ رسالتؐ کے اتنے عرصہ بعد پیدا ہوئے ہیں کہ ہمارے لئے قرآن و حدیث کا مکمل پس منظر، اس کے نزول کے ماحول، اس زمانے کے طرزِ معاشرت اور طرزِ گفتگو کا ہو بہو اور بعینہٖ تصور بڑا مشکل ہے، حالانکہ کسی کی بات کو سمجھنے کے لئے ان تمام باتوں کی پوری واقفیت انتہائی ضروری ہے،

ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اگر ہم اپنی فہم پر اعتماد کرنے کے بجائے قرآن و سنت کے مختلف التعبیر پیچیدہ احکام میں اس مطلب کو اختیار کرلیں جو ہمارے اسلاف میں سے کسی عالم نے سمجھا ہے، تو کہا جائے گا کہ ہم نے فلاں عالم کی تقلید کی ہے،

یہ ہے تقلید کی حقیقت! اگر میں اپنے مافی الضمیر کو صحیح سمجھا سکا ہوں تو یہ بات آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ کسی امام یا مجتہد کی تقلید صرف اس موقع پر کی جاتی ہے جہاں قرآن و سنت سے کسی حکم کے سمجھنے میں کوئی دشواری ہو، خواہ اس بناء پر کہ قرآن و

سنت کی عبارت کے ایک سے زائد معنی نکل سکتے ہوں، خواہ اس بنا پر کہ اس میں کوئی اجمال ہو یا اس بنا پر کہ اس مسئلے میں دلائل متعارض ہوں، چنانچہ قرآن و سنت کے جو احکام قطعی ہیں، یا جن میں کوئی اجمال و ابہام، تعارض یا اسی قسم کی کوئی الجھن نہیں ہے وہاں کسی امام مجتہد کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں، چنانچہ مشہور حنفی عالم علامہ عبدالغنی نابلسیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

فالامر المتفق علیہ المعلوم من الدین بالضرورۃ لایحتاج الی التقلید فیہ لاحد الاربعۃ کفرضیۃ الصلوٰۃ والصوم والزکوٰۃ والحج ونحوھا وحرمۃ الزنا واللواطۃ وشرب الخمر والقتل والسرقۃ والغصب وما اشبہ ذلک والامر المختلف فیہ ھو الذی یحتاج الی التقلید فیہ[1]"

"پس وہ متفقہ مسائل جن کا دین میں ہونا بداہۃً معلوم ہے، ان میں ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں، مثلاً نماز، روزے، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی فرضیت اور زنا، لواطت، شراب نوشی، قتل، چوری اور غصب وغیرہ کی حرمت، درحقیقت تقلید کی ضرورت ان مسائل میں پڑتی ہے جن میں علماء کا اختلاف رہا ہو"

اور علامہ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

واما الاحکام الشرعیۃ فضربان: احدھما یعلم ضرورۃ من دین الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کالصلوات الخمس والزکوٰۃ وصوم شہر رمضان والحج وتحریم الزنا وشرب الخمر وما اشبہ ذلک، فھذا لایجوز

---

[1] خلاصۃ التحقیق فی حکم التقلید والتلفیق، ص ۴ مطبوعہ مکتبۃ ایشیق، استنبول،

التقليد فيه لأن الناس كلهم يشتركون فى ادراكه والعلم به، فلا معنى للتقليد فيه، وضرب آخر لا يعلم الا بالنظر والاستدلال كفروع العبادات والمعاملات والفروج والمناكحات وغير ذلك من الاحكام فهذا يسوغ فيه التقليد بدليل قول الله تعالى فَاسْئَلُوٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ، ولأنا لو منعنا التقليد فى هذه المسائل التى هى من فروع الدين لاحتاج كل احد ان يتعلم ذلك وفى ايجاب ذلك قطع عن المعايش وهلاك الحرث والماشية فوجب ان يسقط[۱]"

"اور شرعی احکام کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ احکام ہیں جن کا جزو دین ہونا بداہۃً ثابت ہے، مثلاً پانچ نمازیں، زکوٰۃ، ..... رمضان کے روزے، حج، زنا اور شراب نوشی کی حرمت اور اسی جیسے دوسرے احکام، تو اس قسم میں تقلید جائز نہیں، کیونکہ ان چیزوں کا علم تمام لوگوں کو ہوتا ہی ہے، لہٰذا اس میں تقلید کے کوئی معنی نہیں اور دوسری قسم وہ ہے جس کا علم فکر و نظر اور استدلال کے بغیر نہیں ہو سکتا، جیسے عبادات و معاملات اور شادی بیاہ کے فروعی مسائل، اس قسم میں تقلید درست ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاسْئَلُوٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ، نیز اس لئے کہ اگر ہم دین کے ان فروعی مسائل میں تقلید کو ممنوع کر دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص باقاعدہ علوم دین کی تحصیل میں لگ جائے، اور لوگوں پر

---

[۱] الفقیہ والمتفقہ، للخطیب البغدادیؒ ج ۲ ص ۶۷، و ۶۸ مطبوعہ دار الافتاء سعودیہ یامن ۱۳۸۹ھ

اس کو واجب کرنے سے زندگی کی تمام ضروریات برباد ہوجائیں گی اور کھیتیوں اور مولیشیوں کی تباہی لازم آئے گی، لہٰذا ایسا حکم نہیں دیا جاسکتا۔"

اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:-

"مسائل تین قسم کے ہیں، اوّل وہ جن میں نصوص متعارض ہیں، دوم وہ جن میں نصوص متعارض نہیں، مگر وجوہ و معانی متعددہ کو محتمل ہوں، گو اختلاف نظر سے کوئی معنی قریب کوئی بعید معلوم ہوتے ہوں، سوم وہ جن میں تعارض بھی نہ ہو اور ان میں ایک ہی معنی ہوسکتے ہوں، پس قسم اوّل میں رفع تعارض کے لئے مجتہد کو اجتہاد کی اور غیر مجتہد کو تقلید کی ضرورت ہوگی، قسم ثانی ظنی الدلالۃ کہلاتی ہے، اس میں تعیین احد الاحتمالات کے لئے اجتہاد و تقلید کی حاجت ہوگی قسم ثالث قطعی الدلالۃ کہلاتی ہے، اس میں ہم بھی نہ اجتہاد کو جائز کہتے ہیں نہ اُس کی تقلید کو۔"[1]

مذکورہ بالا گزارشات سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ کسی امام یا مجتہد کی تقلید کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اُسے بذاتِ خود واجب الاطاعت سمجھکر اتباع کی جارہی ہے، یا اُسے شارع (شریعت بنانے والا، قانون سازی) کا درجہ دیکر اس کی ہر بات کو واجب الاتباع سمجھا جارہا ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ پیروی تو قرآن و سنت کی مقصود ہے، لیکن قرآن و سنت کی مراد کو سمجھنے کے لئے بحیثیت شارحِ قانون اُن کی بیان کی ہوئی تشریح و تعبیر پر اعتماد کیا جارہا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت کے قطعی احکام میں کسی امام یا مجتہد کی تقلید ضروری نہیں سمجھی گئی، کیونکہ وہاں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت

---

[1] الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد، ص ۳۳ مطبوعہ دہلی بجواب شبہ سیزدہم۔

کا اصل مقصد اس کے بغیر بآسانی حاصل ہو جاتا ہے،

یہ بات رکہ جس امام کی تقلید کی جائے اسے صرف شارح قرار دیا جائے بذاتِ خود واجب الاتباع نہ سمجھا جائے) خود اصطلاحِ "تقلید" کے مفہوم میں داخل ہے، چنانچہ علّامہ ابن الہمامؒ اور علامہ ابن نجیمؒ "تقلید" کی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

التقلید العمل بقول من لیس قولہ احدی الحجج بلا حجۃ منہا[۱]

"تقلید کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کا قول مآخذِ شریعت میں سے نہیں ہے اس کے قول پر دلیل کا مطالبہ کئے بغیر عمل کر لینا"

اس تعریف نے واضح کر دیا کہ مقلّد اپنے امام کے قول کو مآخذِ شریعت نہیں سمجھتا، کیونکہ مآخذِ شریعت صرف قرآن وسنت (اور انہی کے ذیل میں اجماع وقیاس) ہیں، البتہ یہ سمجھ کر اس کے قول پر عمل کرتا ہے کہ چونکہ وہ قرآن وسنت کے علوم میں پوری بصیرت کا حامل ہے، اس لئے اس نے قرآن وسنت سے جو مطلب سمجھا ہے وہ میرے لئے زیادہ قابلِ اعتماد ہے،

اب آپ بہ نظرِ انصاف غور فرمائیے کہ اس عمل میں کونسی بات ایسی ہے جسے "گناہ" یا "شرک" کہا جا سکے؟ اگر کوئی شخص کسی امام کو شارع (قانون ساز) یا بذاتِ خود واجب الاطاعت قرار دیتا ہو تو بلاشبہ اس عمل کو شرک کہا جا سکتا ہے، لیکن کسی کو شارحِ قانون قرار دے کر اپنے مقابلے میں اس کی فہم وبصیرت پر اعتماد کرنا تو افلاسِ علم کے اس دور میں اس قدر ناگزیر ہے کہ اس سے کوئی مفر نہیں ہے،

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ پاکستان میں جو قانون نافذ ہے وہ حکومت نے کتابی شکل میں مدوّن اور مرتّب کر کے شائع کر رکھا ہے، لیکن ملک کے کروڑوں عوام میں سے

---

[۱] تیسیر التحریر لامیر بادشاہ البخاریؒ ج ۴ ص ۲۴۶ مطبوعہ مصر ۱۳۵۱ھ و فتح الغفار شرح المنار لابن نجیمؒ ج ۲ ص ۳۷ مطبوعہ مصر ۱۳۵۵ھ

کتنے آدمی ہیں جو براہِ راست قانون کی عبارتیں دیکھ دیکھ کر اس پر عمل کر سکتے ہوں؟! بے پڑھے لکھے افراد کا تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے، ملک کے وہ بہترین تعلیم یافتہ افراد جنھوں نے قانون کا باقاعدہ علم حاصل نہیں کیا، اعلیٰ درجہ کی انگریزی جاننے کے باوجود یہ جرأت نہیں کرتے کہ کسی قانونی مسئلہ میں براہِ راست قانون کی کتاب دیکھیں، اور اس پر عمل کریں، اس کے بجائے جب انھیں کوئی قانون سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ کسی ماہر وکیل کو تلاش کرکے اس کے قول پر عمل کرتے ہیں، کیا کوئی صحیح العقل انسان اس طرزِ عمل کا یہ مطلب سمجھ سکتا ہے کہ انھوں نے اس وکیل کو قانون سازی کا اختیار دیدیا ہے اور وہ ملکی قانون کے بجائے وکلاء کو اپنا حاکم تسلیم کرنے لگے ہیں؟

بالکل یہی معاملہ قرآن وسنت کے احکام کا ہے، کہ اُن کی تشریح وتفسیر کے لئے ائمۂ مجتہدین کی طرف رجوع کرنے اور اُن پر اعتماد کرنے کا نام "تقلید" ہے، لہٰذا تقلید کرنے والے کو یہ الزام نہیں دیا جاسکتا کہ وہ قرآن وسنت کے بجائے ائمۂ مجتہدین کا اتباع کر رہا ہے،

تقلید کی دو صورتیں

پھر اس تقلید کی بھی دو صورتیں ہیں! ایک تو یہ کہ تقلید کے لئے کسی خاص امام ومجتہد کو معیّن نہ کیا جائے، بلکہ اگر ایک مسئلہ میں ایک عالم کا مسلک اختیار کیا گیا ہے تو دوسرے مسئلہ میں کسی دوسرے عالم کی رائے قبول کرلی جائے اس کو "تقلیدِ مطلق" یا "تقلیدِ عام" یا "تقلیدِ غیر شخصی" کہتے ہیں،

اور دوسری صورت یہ ہے کہ تقلید کے لئے کسی ایک مجتہد عالم کو اختیار کیا جائے، اور ہر ایک مسئلہ میں اسی کا قول اختیار کیا جائے، اُسے "تقلیدِ شخصی" کہا جاتا ہے،

تقلید کی ان دونوں قسموں کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک شخص براہِ راست قرآن وسنت سے احکام مستنبط کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو وہ جس مجتہد کو قرآن وسنت کے علوم کا ماہر سمجھتا ہو اس کی فہم وبصیرت اور اس کے تفقہ پر اعتماد کرکے اس کی تشریحات کے مطابق عمل کرتا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کا جواز بلکہ وجوب قرآن وسنت کے بہت سے دلائل سے ثابت ہے۔

قرآن کریم اور تقلید

"تقلید" کی جو حقیقت اوپر بیان کی گئی ہے اس کی اصولی ہدایتیں خود قرآنِ کریم میں موجود ہیں :-

پہلی آیت (۱) قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (نساء : ۵۹)

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو، اور اپنے آپ میں سے "اولوالامر" کی اطاعت کرو۔"

"اولوالامر" کی تفسیر میں بعض حضرات نے تو یہ فرمایا کہ اس سے مراد مسلمان حکام ہیں اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے فقہاء مراد ہیں، یہ دوسری تفسیر حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ[1]، حضرت مجاہدؒ، حضرت عطاء بن ابی رباحؒ، حضرت عطاء بن السائبؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت ابوالعالیہؒ اور دوسرے بہت سے مفسرین سے منقول ہے، اور امام رازیؒ نے اسی تفسیر کو متعدد دلائل کے ذریعہ ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے :-

"اس آیت میں لفظ "اولوالامر" سے علماء مراد لینا اولیٰ ہے"[2]

اور امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ دونوں مراد ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ حکام کی اطاعت سیاسی معاملات میں کی جائے، اور علماء

---

[1] حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ تفسیر معاویہ بن صالح عن علیؓ بن ابی طلحہ کے طریق سے مروی ہے، (ابن جریرؒ ج ۵ ص ۸۸) جو اُن کی روایات کا قوی ترین طریق ہے، (دیکھئے الاتقان نوع ۸۰)

[2] تفسیر کبیر، ج ۳ ص ۳۳۴،

فقہاء کی مسائلِ شریعت کے باب میں[1]، اور علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ امراء کی اطاعت کا نتیجہ بھی بالآخر علماء ہی کی اطاعت ہے، کیونکہ امراء بھی شرعی معاملات میں علماء کی اطاعت کے پابند ہیں فطاعة الامراء تبع لطاعة العلماء[2]

بہرحال اس تفسیر کے مطابق آیت میں مسلمانوں سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کریں اور اُن علماء و فقہاء کی اطاعت کریں جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کے شارح ہیں، اور اسی اطاعت کا اصطلاحی نام "تقلید" ہے،

رہا اسی آیت کا اگلا جملہ جس میں ارشاد ہے کہ :۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ
إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ؕ

"پس اگر کسی معاملے میں تمہارا باہم اختلاف ہو جائے تو اس معاملے کو اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف لوٹا دو اگر اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو"

سو یہ اس تفسیر کے مطابق مستقل جملہ ہے جس میں مجتہدین کو خطاب کیا گیا ہے، چنانچہ امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ "اولوا الامر" کی تفسیر علماء سے کرنے کی تائید میں لکھتے ہیں:

وقوله تعالیٰ عقیب ذلك فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ، يدل على أن أولي الامر هم الفقهاء لأنه أمر سائر الناس بطاعتهم ثم قال فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ الخ فأمر أولي الأمر برد المتنازع فيه الى كتاب الله و سنة نبيه صلى الله عليه وسلم اذ كانت العامة و من ليس من اهل العلم ليست هذه منزلتهم لانهم

---

[1] احکام القرآن للجصاصؒ ج ۲ ص ۲۵۶ باب فی طاعة اولی الأمر،

[2] اعلام الموقعین لابن القیمؒ ج ۱ ص ۷،

لا یعرفون کیفیۃ الرد إلی کتاب اللّٰہ والسنۃ ووجوہ
دلائلہما علی أحکام الحوادث فثبت انہ خطاب للعلماء۔

"اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم دینے کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "اگر کبھی معاملے میں تمہارے درمیان اختلاف ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو" اس بات کی دلیل ہے کہ "اولوالامر" سے مراد فقہا ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو اُن کی اطاعت کا حکم دیا، پھر فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ الخ فرماکر "اولوالامر" کو حکم دیا کہ جس معاملے میں اُن کے درمیان اختلاف ہو اسے اللہ کی کتاب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف لوٹا دو، یہ حکم فقہا ہی کو ہوسکتا ہے، کیونکہ عوام الناس اور غیر اہلِ علم کا یہ مقام نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ اللہ کی کتاب اور سنت کی طرف کسی معاملے کو لوٹانے کا کیا طریقہ ہے؟ اور نہ انھیں نت نئے مسائل مستنبط کرنے کے لئے دلائل کے طریقوں کا علم ہوتا ہے، لہٰذا ثابت ہوگیا کہ یہ خطاب علماء کو ہے[۱]"

مشہور اہلِ حدیث عالم حضرت علامہ نواب صدیق حسن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر میں یہ اعتراف فرمایا ہے کہ "فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ الخ" کا خطاب مجتہدین کو ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

والظاہر أنہ خطاب مستقل مستأنف موجہ للمجتہدین۔

"اور ظاہر یہ ہے کہ یہ مستقل خطاب ہے جس میں روئے سخن مجتہدین کی طرف ہے[۲]"

لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ جو لوگ اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتے، وہ مختلف فیہ مسائل میں براہِ راست قرآن وحدیث سے رجوع کرکے خود فیصلہ کیا کریں

---

[۱] احکام القرآن ج ۲ ص ۲۵۷ [۲] تفسیر فتح البیان ج ۲ ص ۳۰۸، مطبعۃ العاصمۃ، قاہرہ۔

بلکہ پہلے جملے میں خطاب اُن لوگوں کو ہے جو قرآن وسنت سے براہِ راست احکام مستنبط نہیں کر سکتے، اور اُن کا فریضہ یہ بتایا گیا ہو کہ وہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کریں، جس کا طریقہ یہ ہے کہ "اولوالامر" یعنی فقہاء سے مسائل پوچھیں، اور اُن پر عمل کریں، اور دوسرے جملے میں خطاب مجتہدین کو ہو کہ وہ تنازعہ کے موقعہ پر کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کی طرف رجوع کیا کریں، اور اپنی اجتہادی بصیرت کو کام میں لاکر قرآن وسنت سے احکام نکالا کریں، لہٰذا پہلے جملے میں مقلدین کو تقلید کا حکم ہے، اور دوسرے جملے میں مجتہدین کو اجتہاد کا،

دُوسری آیت

قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ (نساء : ۸۳)

"اور جب ان (عوام الناس) کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہو تو یہ اس کی اشاعت کر دیتے ہیں، اور اگر یہ اس معاملے کو رسولؐ کی طرف یا اپنے "اولوالامر" کی طرف لوٹا دیتے تو ان میں سے جو لوگ اس کے استنباط کے اہل ہیں وہ اس (کی حقیقت) کو خوب معلوم کر لیتے"

اس آیت کا پس منظر یہ ہو کہ مدینہ طیبہ کے منافقین جنگ و امن کے بارے میں نت نئی افواہیں اڑاتے رہتے تھے، بعض سادہ لوح مسلمان ان افواہوں پر یقین کر کے انہیں اور آگے بڑھا دیتے، اور اس سے شہر میں بدمزگی اور بدامنی پیدا ہو جاتی تھی، آیتِ مذکورہ نے اہلِ ایمان کو اس طرزِ عمل سے منع کر کے انھیں اس بات کی تلقین فرمائی کہ جنگ و امن کے بارے میں جو کوئی بات اُن تک پہنچے وہ اس کے مطابق از خود کوئی عمل کرنے کے بجائے اُسے "اولوالامر" تک پہنچا دیں' ان میں سے جو حضرات تحقیق و استنباط کے اہل ہیں' وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ کر حقیقت معلوم کر لیں گے، اور انھیں اس سے باخبر کر دیں گے، لہٰذا ان کا کام ان

اطلاعات پراز خود کوئی ایکشن لینا نہیں، بلکہ ان باتوں سے "اولوالامر" کو مطلع کر کے ان کے احکام کی تعمیل ہے،

یہ آیت اگرچہ ایک خاص معاملے میں نازل ہوئی ہے، لیکن جیساکہ اصولِ تفسیر اوراصولِ فقہ کا مسلّم قاعدہ ہے، آیات سے احکام ومسائل مستنبط کرنے کے لئے شانِ نزول کے خصوصی حالات کے بجائے آیت کے عمومی الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے، اس لئے اس آیت سے یہ اصولی ہدایت مل رہی ہے کہ جو لوگ تحقیق و نظر کی صلاحیت نہیں رکھتے اُن کو اہلِ استنباط کی طرف رجوع کرنا چاہئے، اور وہ اپنی اجتہادی بصیرت کو کام میں لاکر جو راہِ عمل متعین کریں اس پر عمل کرنا چاہئے، اور اسی کا نام تقلید ہے، چنانچہ امام رازیؒ اس آیت کے تحت تحریر فرماتے ہیں :۔

فثبت انّ الاستنباط حجة، والقياس امّا استنباط اوداخل فيه، فوجب ان يكون حجة اذا ثبت هٰذا فنقول: الآية دالّة على امور أحدها أن فى احكام الحوادث مالايعرف بالنص بل بالاستنباط وثانيها ان الاستنباط حجة، وثالثها انّ العامّى يجب عليه تقليد العلماء فى احكام الحوادث،

پس ثابت ہوا کہ استنباط حجت ہے، اور قیاس یا تو بذاتِ خود استنباط ہوتا ہے یا اس میں داخل ہوتا ہے، لہٰذا وہ بھی حجت ہوا، جب یہ بات طے ہوگئی تو اب ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت چند امور کی دلیل ہے، ایک یہ کہ نت نئے پیش آنے والے مسائل میں بعض امور ایسے ہوتے ہیں جو نص سے (صراحۃً) معلوم نہیں ہوتے، بلکہ اُن کا حکم معلوم کرنے کے لئے استنباط کی ضرورت پڑتی ہے، دوسرے یہ کہ استنباط حجت ہے، اور تیسرے یہ کہ عام آدمی پر واجب ہے کہ وہ پیش آنے والے مسائل و احکام کے بارے میں علماء کی تقلید کرے،[1]

---

[1] تفسیر کبیر، ج ۳ ص ۲۷۲۔

بعض حضرات نے اس استدلال پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ آیت جنگ کے مخصوص حالات پر مشتمل ہے، لہٰذا زمانۂ امن کے حالات کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا[1] لیکن اس اعتراض کا جواب ہم شروع میں دے چکے ہیں کہ اعتبار آیت کے عام الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ شانِ نزول کے مخصوص حالات کا، چنانچہ امام رازیؒ اس اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں :-

ان قوله وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ عام فی کل ما یتعلق بالحروب وفیما یتعلق بسائر الوقائع الشرعیۃ، لأن الامن والخوف حاصل فی کل ما یتعلق بباب التکلیف، فثبت أنه لیس فی الآیة ما یوجب تخصیصها بأمر الحروب[2]،

"اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ "جب اُن کے سامنے امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے الخ" بالکل عام ہے جس میں جنگ کے حالات بھی داخل ہیں اور تمام شرعی مسائل بھی، اس لئے کہ امن اور خوف ایسی چیزیں ہیں کہ تکلیفاتِ شرعیہ کا کوئی باب ان سے باہر نہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اُسے صرف جنگ کے حالات سے مخصوص کردے "

امام ابوبکر جصّاص رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس اعتراض کا یہی جواب نہایت تفصیل کے ساتھ دیا ہے، اور اس بارے میں ضمنی شبہات کی بھی تردید فرمائی ہے[3] یہی وجہ ہے کہ مشہور اہلِ حدیث عالم نواب صدیق حسن خانصاحبؒ نے اسی آیت سے قیاس کے جواز پر استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے :-

---

[1] تحریکِ آزادیِ فکر از مولانا محمد اسمٰعیل سلفیؒ، ص ۱۳۱ ، [2] تفسیر کبیر، ج ۳ ص ۲۷۲
[3] احکام القرآن للجصاصؒ ج ۲ ص ۲۶۳ باب طاعۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ،

فی الآیۃ اشارۃ الی جواز القیاس، وان من العلم ... ما یدرک بالاستنباط[1]،

اگر آیت سے "زمانۂ امن" کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں ملتی تو قیاس کے جواز پر اس سے استدلال کیسے درست ہوگیا؟

تیسری آیت قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝ (التوبۃ: ۱۲۳)

"پس کیوں نہ نکل پڑا ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ تاکہ یہ لوگ دین میں تفقہ حاصل کریں اور تاکہ لوٹنے کے بعد اپنی قوم کو ہوشیار کریں شاید کہ وہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے) بچیں"

اس آیت میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ مسلمانوں میں تمام افراد کو جہاد وغیرہ کے کاموں میں مشغول نہ ہوجانا چاہیے، بلکہ ان میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو اپنے شب و روز "تفقہ" (دین کی سمجھ) حاصل کرنے کے لئے وقف کردے، اور اپنا اوڑھنا بچھونا علم کو بنائے، تاکہ یہ جماعت اُن لوگوں کو احکامِ شریعت بتلائے جو اپنے آپ کو تحصیلِ علم کے لئے فارغ نہیں کرسکے،

لہٰذا اس آیت نے علم کے لئے مخصوص ہوجانے والی جماعت پر یہ لازم کیا ہے کہ وہ دوسروں کو احکامِ شریعت سے باخبر کرے، اور دوسروں کے لئے اس بات کو ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اُن کے بتلائے ہوئے احکام پر عمل کریں، اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے محفوظ رہیں، اور اسی کا نام تقلید ہے، چنانچہ امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ اس آیت پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] تفسیر فتح البیان از نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ ج ۲ ص ۳۲۰،

فأوجب الحذر من انذارهم والزم المنذرين قبول قولهم،[۱]

"اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں پر واجب کیا ہے کہ جب علماء اُن کو (احکام شریعت بتاکر) ہوشیار کریں تو وہ (اللہ کی نافرمانی سے) بچیں، اور علماء کی بات مانیں"

چوتھی آیت

قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

(النحل، ۴۳ و الانبیاء : ۷)

"اگر تمہیں علم نہ ہو تو اہلِ ذکر سے پوچھ لو ......"

اس آیت میں یہ اصولی ہدایت دیدی گئی ہے کہ جو لوگ کسی علم وفن کے ماہر نہ ہوں انھیں چاہئے کہ وہ اس علم وفن کے ماہرین سے پوچھ پوچھ کر عمل کیا کریں، اور یہی چیز تقلید کہلاتی ہے، چنانچہ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں :-

واستدل بها ايضا على وجوب المراجعة للعلماء فيما لا يعلم وفي الاكليل للجلال...... السيوطي انه استدل بها على جواز تقليد العامي في الفروع،[۲]

"اور اس آیت سے اس بات پر بھی استدلال کیا گیا ہے کہ جس چیز کا علم خود نہ ہو اس میں علماء سے رجوع کرنا واجب ہے، اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ اکلیل میں لکھتے ہیں کہ اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ عام آدمیوں کے لئے فروعی مسائل میں تقلید جائز ہے"

۱؎ احکام القرآن للجصاصؒ ج ۲ ص ۲۶۲، باب طاعة الرسول صلی اللہ علیہ وسلم،

۲؎ روح المعانی ج ۱۴ ص ۱۴۸ سورۂ نحل،

اس پر بعض حضرات کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ آیت ایک خاص موضوع سے متعلق ہے، اور وہ یہ کہ مشرکین مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس کسی فرشتے کو رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا؟ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، جس کے پورے الفاظ یہ ہیں:-

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

"اور ہم نے آپؐ سے پہلے بھی مرد ہی رسول بنا کر بھیجے ہیں جن پر ہم وحی نازل کرتے تھے، پس اگر تمہیں معلوم نہ ہو تو "اہل الذکر" سے پوچھ لو"

"اہل الذکر" سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک علماء اہل کتاب ہیں، بعض کے نزدیک وہ اہل کتاب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مسلمان ہو گئے تھے، اور بعض کے نزدیک اہل قرآن یعنی مسلمان، اور مطلب یہ ہے کہ یہ تمام حضرات اس حقیقت سے واقف ہیں کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام بشر تھے، ان میں سے کوئی بھی فرشتہ نہ تھا، لہٰذا آیت کا سیاق و سباق تقلید و اجتہاد کے مفہوم سے متعلق نہیں ہے،

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت دلالۃ النص کے طور پر تقلید کے مفہوم پر دلالت کر رہی ہے، "اہل الذکر" سے خواہ کوئی مراد ہو، لیکن ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم ذاتی ناواقفیت کی بناء پر دیا گیا ہے، اور یہ بات اسی وقت درست ہو سکتی ہے جب یہ اصول مان لیا جائے کہ "ہر ناواقف کو واقف کی طرف رجوع کرنا چاہئے" یہی وہ اصول ہے جس کی طرف یہ آیت رہنمائی کر رہی ہے، اور اسی سے تقلید پر استدلال کیا جا رہا ہے، اور یہ بات ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ اصولِ تفسیر اور اصولِ فقہ کا یہ مسلّم قاعدہ ہے "العبرۃ بعموم اللفظ لا لخصوص المورد" یعنی اعتبار آیت کے عمومی الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خاص اس صورت کا جس کے لئے آیت نازل ہوئی ہے، لہٰذا آیت کا نزول اگرچہ خاص مشرکین مکّہ کے جواب میں ہوا ہے، لیکن چونکہ اس کے

الفاظ عام ہیں، اس لئے اس سے یہ اصول بلا شبہ ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ خود علم نہ رکھتے ہوں انھیں اہلِ علم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور یہی تقلید کا حاصل ہے چنانچہ خطیب بغدادیؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

اما من یسوغ لہ التقلید فھو العامی الذی لا یعرف طرق الاحکام الشرعیۃ، فیجوز لہ ان یقلد عالما و یعمل بقولہ، قال اللہ تعالیٰ "فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ"[1]

"رہا یہ مسئلہ کہ تقلید کس کے لئے جائز ہے، سو یہ وہ عامی شخص ہے جو احکامِ شرعیہ کے طریقے نہیں جانتا پس اس کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی عالم کی تقلید کرے اور اس کے قول پر عمل کرے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ الخ"

اس کے بعد خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عمرو بن قیسؒ کا قول نقل کیا ہے کہ آیتِ بالا میں اہل الذکر سے مراد اہلِ علم ہیں،

تقلید اور حدیث

قرآنِ کریم کی طرح بہت سی احادیث سے بھی تقلید کا جواز ثابت ہوتا ہے، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

(۱) عن حذیفۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی لا أدری ما بقائی فیکم، فاقتدوا باللذین من بعدی أبی بکر وعمر (رواہ الترمذی وابن ماجہ واحمد)[2]

"حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنا عرصہ تمہارے

---

[1] الفقیہ والمتفقہ، للخطیب البغدادیؒ ج ۲ ص ۶۸ مطبوعہ دار الافتاء سعودیہ ریاض ۱۳۸۹ھ

[2] مرقاۃ المفاتیح ج ۵ ص ۵۴۹ باب مناقب ابی بکرؓ وعمرؓ،

درمیان رہوں گا! پس تم میرے بعد دو شخصوں کی اقتدار کرنا، ایک ابوبکرؓ، دوسرے عمرؓ،

یہاں یہ بات بطور خاص قابلِ غور ہے کہ حدیث میں لفظ "اقتدار" استعمال کیا گیا ہے، جو انتظامی امور میں کسی کی اطاعت کے لئے نہیں، بلکہ دینی امور میں کسی کی پیروی کے لئے استعمال ہوتا ہے، عربی لغت کے مشہور عالم ابن منظورؒ لکھتے ہیں: "القُدْوَةُ والقِدْوَةُ مَا تَسَنَّنْتَ بِهِ" (یعنی قدوہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی سنت پر تم عمل کرو) آگے لکھتے ہیں: "القدوۃ الأسوۃ"[1] (قدوہ کے معنی ہیں "اسوہ" یعنی نمونہ) قرآن کریم میں بھی یہ لفظ دینی امور میں انبیاء علیہم السلام اور صلحاء کی پیروی کے لئے استعمال ہوا ہے، ارشاد ہے:۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (انعام: ۹۰)

"یہی لوگ ہیں جنکو اللہ نے ہدایت دی ہے، پس تم اُن کی ہدایت کی اقتدار کرو"

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرضِ وفات کے واقعہ میں ہے کہ:۔

یقتدی أبوبکرؓ بصلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والناس مقتدون بصلوٰۃ أبی بکرؓ"[2]

"حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی اقتدار کر رہے تھے اور لوگ حضرت ابوبکرؓ کی نماز کی اقتدار کر رہے تھے"

اور "مسندِ احمدؒ" میں حضرت ابو وائلؒ کی روایت ہے:۔

جلست الی شیبة بن عثمانؓ، فقال جلس عمر بن الخطابؓ فی مجلسك هذا، فقال لقد هممت أن لا أدع فی

---

[1] لسان العرب ج ۲۰ ص ۳۱ مادہ "قدا" [2] صحیح بخاری، باب الرجل یأتم بالامام ج ۱ ص ۹۹،

الكعبة صفراء ولا بيضاء الا قسمتهما بين الناس، قال قلت: ليس ذلك لك، قد سبقك صاحباك لم يفعلا ذلك، فقال هما المرآن يقتدى بهما،[1]

"میں شیبہ بن عثمانؓ کے پاس بیٹھا تھا، انھوں نے کہا کہ (ایک دن) حضرت عمرؓ اسی جگہ بیٹھے تھے جہاں تم بیٹھے ہو، وہ فرمانے لگے کہ میرا ارادہ ہوتا ہے کہ کعبہ میں جتنا سونا چاندی ہوتا ہے وہ سب لوگوں کے درمیان تقسیم کر دوں، شیبہؓ کہتے ہیں میں نے کہا کہ اس کا آپ کو حق نہیں، کیونکہ آپ کے دونوں پیش رو صاحبان (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ) نے ایسا نہیں کیا، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ دونوں حضرات واقعی ایسے ہیں کہ اُن کی اقتداء کی جانی چاہیے"

نیز مسند احمدؒ ہی میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ: "ابھی تمھاری مجلس میں ایک جنتی شخص داخل ہوگا" چنانچہ اس کے بعد ایک انصاری صحابی داخل ہوئے، دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا، اور تیسرے دن بھی، اس پر حضرت عبداللہ بن عمروؓ ایک دن اُن انصاری صحابی کے پاس پہونچ گئے، اور رات کو اُن کے یہاں رہے، خیال یہ تھا کہ وہ بہت عبادت کرتے ہوں گے، مگر دیکھا کہ انھوں نے صرف اتنا کیا کہ سوتے وقت کچھ اذکار پڑھے اور پھر فجر تک سوتے رہے، حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اُن سے کہا:

فأردت أن آوي اليك لأنظر ما عملك؟ فأقتدي به فلم أرك تعمل كثير عمل[2]

---

[1] مسند احمدؒ ج ۳ ص ۴۱۰ مسند شیبۃ بن عثمانؓ [2] حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے جواب میں انصاری صحابیؓ نے بتایا کہ میں عمل تو کوئی خاص نہیں کرتا البتہ میرے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے کھوٹ نہیں ہے، نہ میں کسی پر حسد کرتا ہوں' اخرجہ احمد من طریق عبدالرزاق ثنا معمر عن الزہری اخبرنا انسؓ وہو اسناد صحیح (مسند احمد، ج ۳ ص ۱۶۶ مسندات انسؓ)

میں تو اس ارادے سے تمھارے پاس رات گزارنے آیا تھا کہ تمھارا
عمل دیکھوں اور اس کی اقتدا کروں"

ان تمام مقامات پر "اقتدا" دینی امور میں کسی کی اتباع اور پیروی کے لئے آیا ہے، خاص طور سے پہلی دو احادیث میں تو اس لفظ کا استعمال حضرت ابو بکرؓ کے لئے اسی معنی میں ہوا ہے، لہٰذا مذکورہ بالا حدیث کا اصل مقصد دینی امور میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کا حکم دینا ہے، اور اسی کا نام تقلید ہے،

(۲) صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

ان اللّٰہ لا یقبض العلم انتزاعاً ینتزعہ من العباد،
ولکن یقبض العلم بقبض العلماء، حتّٰی اذا لم یبق
عالماً اتخذ الناس رءوساً جهّالاً، فسئلوا فأفتوا بغیر
علم فضلّوا وأضلّوا[۱]،

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ علم کو (دنیا سے) اس طرح سے نہیں اٹھائے گا
کہ اسے بندوں (کے دل) سے سلب کرلے، بلکہ علم کو اس طرح اٹھائے گا
کہ علماء کو (اپنے پاس) بلالے گا، یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی
نہ چھوڑے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، ان سے سوالات
کئے جائیں گے تو وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے، خود بھی گمراہ ہونگے
اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے"

اس حدیث میں واضح طور سے فتویٰ دینا علماء کا کام قرار دیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ لوگ ان سے مسائل شرعیہ پوچھیں، وہ ان کا حکم بتائیں، اور لوگ اس پر عمل کریں، یہی تقلید کا حاصل ہے،

---

[۱] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، الفصل الاوّل، صفحہ ۳۳،

پھر اس حدیث میں ایک اور بات بطور خاص قابلِ غور ہے، اور وہ یہ کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے زمانے کی خبر دی ہے جس میں علماء مفقود ہو جائیں گے، اور جاہل قسم کے لوگ فتوے دینے شروع کر دیں گے، یہاں سوال یہ ہے کہ اس دَور میں احکامِ شریعت پر عمل کرنے کی سوائے اس کے اور کیا صورت ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ گذرے ہوئے علماء کی تقلید کریں، کیونکہ جب زندہ لوگوں میں کوئی عالم نہیں بچا تو نہ کوئی شخص براہِ راست قرآن و سنت سے احکام مستنبط کرنے کا اہل رہا، اور نہ کسی زندہ عالم کی طرف رجوع کرنا اس کی قدرت میں ہے، کیونکہ کوئی عالم موجود ہی نہیں، لہٰذا احکامِ شریعت پر عمل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں رہتی کہ جو علماء وفات پا چکے ہیں اُن کی تصانیف وغیرہ کے ذریعہ ان کی تقلید کی جائے،

لہٰذا یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب تک علمائے اہلِ اجتہاد موجود ہوں اُس وقت تک اُن سے مسائل معلوم کئے جائیں، اور اُن کے فتووں پر عمل کیا جائے، اور جب کوئی عالم باقی نہ رہے تو نا اہل لوگوں کو مجتہد سمجھ کر ان کے فتووں پر عمل کرنے کے بجائے گزشتہ علماء میں سے کسی کی تقلید کی جائے،

۳ - حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

مَنْ اُفْتِيَ بِغَيْرِ عِلْمٍ كَانَ اِثْمُهٗ عَلٰى مَنْ اَفْتَاهُ (رواہ ابوداؤد)[1]

"جو شخص بغیر علم کے فتویٰ دے گا اُس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا"

یہ حدیث بھی تقلید کے جواز پر بڑی واضح دلیل ہے، اس لئے کہ اگر تقلید جائز نہ ہوتی اور کسی کے فتوے پر دلیل کی تحقیق کے بغیر عمل جائز نہ ہوتا تو مذکورہ صورت میں سارا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہی کیوں ہوتا؟ بلکہ جس طرح مفتی کو بغیر علم کے فتویٰ دینے کا گناہ ہوتا اسی طرح سوال کرنے والے کو اس بات کا گناہ ہونا چاہئے تھا کہ

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، الفصل الثانی، ص ۲۷،

اس نے فتوے کی صحت کی کیوں تحقیق نہیں کی؟ لہٰذا حدیث بالا نے یہ واضح فرما دیا کہ جو شخص خود عالم نہ ہو اس کا فریضہ صرف اس قدر ہے کہ وہ کسی ایسے شخص سے مسئلہ پوچھ لے جو اس کی معلومات کے مطابق قرآن وسنت کا علم رکھتا ہو، اس کے بعد اگر وہ عالم اُسے غلط مسئلہ بتائے گا تو اس کا گناہ پوچھنے والے پر نہیں ہوگا، بلکہ بتانیوالے پر ہوگا،

(۴) حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰن العذریؒ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

یحمل ھٰذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف
الغالین وانتحال المبطلین وتأویل الجاھلین،
(رواہ البیہقی فی المدخل)[1]

"ہر آنے والی نسل کے ثقہ لوگ اس علم دین کے حامل ہوں گے جو اس سے
غلو کرنے والوں کی تحریف کو، باطل پرستوں کے جھوٹے دعووں کو،
اور جاہلوں کی تاویلات کو دور کریں گے"۔

اس حدیث میں "جاہلوں کی تاویلات" کی مذمت کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ان تاویلات کی تردید علماء کا فریضہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ قرآن وسنت کے علوم میں مجتہدانہ بصیرت نہیں رکھتے انھیں اپنی فہم پر اعتماد کرکے احکام قرآن و سنت کی تاویل نہیں کرنی چاہئے، بلکہ قرآن وسنت کی صحیح مراد سمجھنے کے لئے اہل علم کی طرف رجوع کرنا چاہئے، اور اسی کا نام "تقلید" ہے، پھر یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن وسنت میں تاویلات وہی شخص کر سکتا ہے جسے کچھ تھوڑی بہت شُدبُد ہو لیکن ایسے شخص کو بھی حدیث میں "جاہل" قرار دیا گیا ہے اور اس کی "تاویل" کی مذمت کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن وسنت سے احکام ومسائل کے استنباط کے لئے

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، الفصل الثانی، ص ۳۶،

عربی زبان وغیرہ کی معمولی شُدبُد کافی نہیں، بلکہ اس میں مجتہدانہ بصیرت کی ضرورت ہو۔

۵۔ صحیح بخاریؒ میں تعلیقاً اور صحیح مسلمؒ میں مسنداً حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ بعض صحابہؓ جماعت میں دیر سے آنے لگے تھے، تو آپؐ نے انھیں جلدی آنے اور اگلی صفوں میں نماز پڑھنے کی تاکید فرمائی، اور ساتھ ہی فرمایا:۔

ایتموا بی ولیأتم بکم من بعدکم[1]

"تم مجھے دیکھ دیکھ کر میری اقتدا کرو، اور تمھارے بعد والے لوگ تمھیں دیکھ دیکھ کر تمھاری اقتدا کریں"

اس کا ایک مطلب تو یہ ہی کہ اگلی صفوں کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ دیکھ کر آپؐ کی اقتدا کریں، اور پچھلی صفوں کے لوگ اگلی صف کے لوگوں کو دیکھ کر اُن کی اقتدا کریں، اس کے علاوہ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ جلدی آیا کریں، تاکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقِ نماز کو اچھی طرح دیکھ لیں، کیونکہ صحابہؓ کے بعد جو نسلیں آئیں گی وہ صحابہؓ کی تقلید اور ان کی اتباع کریں گی، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

وقیل معناہ تعلموا منی أحکام الشریعۃ، ولیتعلم منکم التابعون بعدکم وکذلک أتباعھم الی انقراض الدنیا[2]

"بعض حضرات نے اس حدیث کا مطلب یہ بتایا ہو کہ تم مجھ سے احکامِ شریعت سیکھ لو، اور تمھارے بعد آنے والے تابعین تم سے سیکھیں، اور اسی طرح اُن کے متبعین ان سے سیکھیں، اور یہ سلسلہ دنیا کے خاتمے تک چلتا رہے"

---

[1] صحیح بخاری، باب الرجل یأتم بالامام ویأتم الناس بالمأموم، ج ۱ ص ۹۹،

[2] فتح الباری، ج ۲ ص ۱۷۱ طبع مصریہ ۱۳۰۰ھ

۶۔ مسند احمدؒ میں حضرت سہل بن معاذؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں:۔

ان امرأۃ اتتہ فقالت یارسول اللہؐ انطلق زوجی
غازیاً وکنت اقتدی بصلاتہ اذا صلّی وبفعلہ کلہ
فاخبرنی بعمل یبلغنی عملہ حتی یرجع[۱] الخ،

"ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور عرض کیا، کہ یارسول اللہؐ! میرا شوہر جہاد کے لئے چلا گیا ہے، اور جب وہ نماز پڑھتا تو میں اس کی پیروی کرتی تھی، اور اس کے تمام افعال کی اقتداء کرتی تھی، اب آپ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو مجھے اس کے عمل (یعنی جہاد) کے برابر پہنچا دے"

یہاں اس خاتون نے صراحۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں اپنے شوہر کی صرف نماز میں نہیں، بلکہ تمام افعال میں اقتداء کرتی ہوں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی،

۷۔ جامع ترمذیؒ میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص میں دو خصلتیں ہوں گی اللہ تعالیٰ اسے شاکر و صابر لکھے گا، وہ خصلتیں یہ ہیں:۔

مَنْ نظر فی دینہ الیٰ من ھو فوقہ فاقتدیٰ بہ
ونظر فی دنیاہ الیٰ من ھو دونہ فحمد اللہ،

"جو شخص دین کے معاملے میں اپنے سے بلند مرتبہ شخص کو دیکھے اور اس کی اقتداء کرے، اور دنیا کے معاملے میں نیچے کے شخص کو

---

[۱] مسند احمدؒ ج ۳ ص ۴۳۹ مسند معاذ بن انسؓ، وأوردہ الہیثمیؒ (فی مجمع الزوائد) وقال: رواہ احمد وفیہ زبان بن فائد، وثقہ ابوحاتم وضعفہ جماعۃ، وبقیۃ رجالہ ثقات (الفتح الربانی ج ۱۴، ص ۱۶ فضل المجاہدین)۔

دیکھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے مجھے اس سے اچھی حالت میں رکھا ہے۔[1]

عہدِ صحابہؓ اور تقلیدِ مطلق

چنانچہ عہدِ صحابہؓ میں بکثرت تقلید پر عمل ہوتا رہا ہے، یعنی جو حضراتِ صحابہؓ تحصیلِ علم میں زیادہ وقت صرف نہیں کر سکتے تھے، یا کسی خاص مسئلے میں اپنے اجتہاد سے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے تھے وہ دوسرے فقہاءِ صحابہؓ سے پوچھ پوچھ کر عمل کیا کرتے تھے، اور ان حضرات میں تقلیدِ مطلق اور تقلیدِ شخصی دونوں صورتوں کا ذکر ملتا ہے، خاص طور سے تقلیدِ مطلق کی مثالیں تو اس کثرت سے ہیں کہ ان سے پوری ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے ان میں سے چند مثالیں درج ذیل ہیں :-

(۱) عن ابن عباسؓ قال خطب عمر بن الخطاب الناس بالجابیة وقال یا أیها الناس من اراد ان یسأل عن القرآن فلیأت أبی بن کعبؓ، ومن أراد أن یسأل عن الفرائض فلیأت زید بن ثابتؓ ومن أراد أن یسأل عن الفقه فلیأت معاذ بن جبلؓ، ومن أراد أن یسأل عن المال فلیأتنی فان الله جعلنی له والیاً وقاسماً، (رواه الطبرانی فی الاوسط)[2]

---

[1] جامع ترمذی بشرح ابن العربیؒ ج ۹ ص ۳۱۲، ابواب القیامہ باب بلا ترجمہ،

[2] ذکره الہیثمیؒ وقال: "وفیه سلیمان بن داؤد بن الحصین لم أر من ذکره" (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۳۵ باب آخذ کل علم من اہلہ) قلت: ذکره ابن ابی حاتمؒ فی الجرح والتعدیل (ج ۲ قسم ۱ ص ۱۱۱) والخطیبؒ فی تاریخ بغداد (ج ۱۰ ص ۶۲) فلم یصفہ احدہما بجرح ولا تعدیل، وہو ابن لداؤد بن الحصینؒ، تقی

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے جابیہ کے مقام پر خطبہ دیا، اور فرمایا، اے لوگو! جو شخص قرآن کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہو وہ ابی بن کعبؓ کے پاس جائے، جو میراث کے احکام کے بارے میں پوچھنا چاہے وہ زید بن ثابتؓ کے پاس جائے، اور جو شخص فقہ کے بارے میں پوچھنا چاہے وہ معاذ بن جبلؓ کے پاس جائے، اور جو شخص مال کے بارے میں سوال کرنا چاہے وہ میرے پاس آجائے، اس لئے کہ اللہ نے مجھے اس کا والی اور تقسیم کنندہ بنایا ہے۔"

اس خطبے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو عام طور پر یہ ہدایت فرمائی کہ تفسیر، فرائض اور فقہ کے معاملات میں ان ممتاز علماء سے رجوع کرکے ان سے معلومات کیا کریں، اور ظاہر ہے کہ ہر شخص دلائل سمجھنے کا اہل نہیں ہوتا، اس لئے یہ حکم دونوں صورتوں کو شامل ہے کہ جو لوگ اہل ہوں وہ ان علماء سے دلائل بھی سمجھیں، اور جو اہل نہ ہوں وہ محض اُن کے اقوال پر اعتماد کرکے ان کے بتائے ہوئے مسائل پر عمل کریں، جس کا نام تقلید ہے، چنانچہ صحابۂ کرامؓ میں سے جو حضرات اپنے آپ کو اہلِ استنباط واجتہاد نہیں سمجھتے تھے وہ فقہاءِ صحابہؓ سے رجوع کرتے وقت اُن سے دلائل کی تحقیق نہیں فرماتے تھے، بلکہ اُن کے بتائے ہوئے مسائل پر اعتماد کرکے عمل فرماتے تھے، جس کی نظیریں آگے آرہی ہیں:۔

۲۔ عن سالم بن عبد اللہ عن عبد اللہ بن عمرؓ أنه سئل عن الرجل یکون له الدین علی الرجل الی أجل فیضع عنه صاحب الحق ویعجله الآخر، فکره ذلك عبد اللہ بن عمرؓ ونهی عنه۔[1]

---

[1] موطأ امام مالکؒ، ص ۲۷۹ ما جاء فی الربا فی الدین،

"حضرت سالمؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ کسی شخص کا دوسرے شخص پر کچھ میعادی قرض واجب ہے، اور صاحب حق اس میں سے کسی قدر اس شرط پر معاف کرتا ہے کہ وہ میعاد سے پہلے ادائیگی کردے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کو ناپسند کیا، اور اس سے منع فرمایا"

اس مثال میں جو مسئلہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا گیا، اس میں کوئی صریح حدیث مرفوع منقول نہیں، اس لئے یہ حضرت ابن عمرؓ کا اپنا اجتہاد و قیاس تھا، یہاں نہ سوال کرنے والے نے دلیل پوچھی، نہ حضرت ابن عمرؓ نے بتائی اور یہی تقلید ہے،

(۳) عن عبد الرحمٰن قال سألت محمد بن سيرين عن دخول الحمام، فقال: كان عمر بن الخطابؓ يكرهه[۱]

"عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن سیرینؒ سے پوچھا کہ (غسل کے لئے) حمام میں داخل ہونا جائز ہے؟ انھوں نے فرمایا، کہ حضرت عمرؓ اُسے مکروہ کہتے تھے"

ملاحظہ فرمائیے، یہاں حضرت محمد بن سیرینؒ جیسے جلیل القدر تابعی نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا فرمایا کہ "حضرت عمرؓ اسے مکروہ کہتے تھے، اور اس کی کوئی دلیل نہیں بتائی، حالانکہ اس ... بارے میں مرفوع احادیث بھی موجود ہیں، اور ایک حدیث خود حضرت عمرؓ سے بھی مروی ہے[۲]،

(۴) عن سليمان بن يسار أن أبا أيوب الأنصاريؓ خرج حاجا حتى اذا كان بالنازية من طريق مكة أضل رواحله و

---

[۱] اخرجہ مسدد (المطالب العالیہ للحافظ ابن حجرؒ ج ۱ ص ۱۵ حدیث نمبر ۱۸۷)

[۲] دیکھئے الفتح الربانی (ترتیب مسند احمدؒ) ج ۲ ص ۱۵۰ حدیث نمبر ۴۹۴،

انه قدم علیٰ عمر بن الخطابؓ یوم النحر فذکر ذلک له فقال عمر بن الخطابؓ اصنع ما یصنع المعتمر، ثم قد حللت، فاذا أدرکت الحج قابلاً فاحجج واَهْدِ مَا استیسر من الهدی۔[1]

"حضرت سلیمان بن یسارؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ حج کے ارادے سے نکلے، یہاں تک کہ جب مکہ مکرمہ کے راستہ میں نازیہ کے مقام تک پہنچے تو ان کی سواریاں گم ہوگئیں، اور وہ یوم النحر (۱۰ ذی الحجہ) میں (جبکہ حج ہوچکا تھا) حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے، اور ان سے یہ واقعہ ذکر کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم وہ ارکان ادا کرو جو عمرہ والا ادا کرتا ہے (یعنی طواف اور سعی) اس طرح تمہارا احرام کھل جائے گا، پھر اگلے سال جب حج کا زمانہ آئے تو دوبارہ حج کرو، اور جو قربانی میسّر ہو ذبح کرو"

یہاں بھی نہ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے مسئلے کی دلیل پوچھی اور حضرت عمرؓ نے بتائی، بلکہ حضرت عمرؓ کے علم وفہم پر اعتماد کرکے عمل فرمایا، اسی کو تقلید کہتے ہیں،

(۵) عن مصعب بن سعد قال کان ابی اذا صلّٰی فی المسجد تجوّز وأتم الرکوع والسجود والصلوٰة واذا صلّٰی فی البیت أطال الرکوع والسجود والصلوٰة، قلت یا أبتاه اذا صلّیت فی المسجد جوّزت واذا صلّیت فی البیت أطلت؟ قال یا بنیّ انا ائمة یقتدی

---

[1] موطا امام مالکؒ، ص ۱۴۹، هدی من فاته الحج،

بنا، رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہ رجال الصحیح[۱]،

"حضرت مصعب بن سعدؓ فرماتے ہیں کہ میرے والد (حضرت سعد بن ابی وقاصؓ) جب مسجد میں نماز پڑھتے تو رکوع اور سجدہ پورا تو کرلیتے مگر اختصار سے کام لیتے، اور جب گھر میں نماز پڑھتے تو رکوع سجدہ اور نماز (کے دوسرے ارکان) طویل فرماتے، میں نے عرض کیا، ابا جان! آپ جب مسجد میں نماز پڑھتے ہیں تو اختصار سے کام لیتے ہیں، اور جب گھر میں پڑھتے ہیں تو طویل نماز پڑھتے ہیں؟...... .... حضرت سعدؓ نے جواب دیا کہ بیٹے! ہم (لوگوں کے) امام ہیں، لوگ ہماری اقتدا کرتے ہیں (یعنی لوگ ہمیں طویل نماز پڑھتے دیکھیں گے تو اتنی لمبی نماز پڑھنا ضروری سمجھیں گے، اور بیجا اس کی پابندی شروع کردیں گے)۔"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ عام لوگ صحابۂ کرامؓ کے صرف اقوال ہی کی تقلید نہیں کرتے تھے، بلکہ بڑے صحابہؓ کا صرف عمل دیکھکر اس کی بھی تقلید کی جاتی تھی، اور ظاہر ہے کہ عمل دیکھکر اس کی اقتداء کرنے میں دلائل کی تحقیق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی لئے یہ حضرات اپنے عمل میں اتنی باریکیوں کا بھی لحاظ رکھتے تھے،

(۶) اسی طرح مؤطا امام مالکؒ میں روایت ہے:۔

ان عمر بن الخطابؓ رأى على طلحة بن عبيد الله ثوبا مصبوغا وهو محرم، فقال عمرؓ: ما هذا الثوب المصبوغ يا طلحة؟ فقال طلحة بن عبيد الله، يا امير المؤمنين انما هو مدر، فقال عمرؓ: انكم ايها الرهط أئمة يقتدى بكم الناس، فلو ان

---

[۱] مجمع الزوائد للہیثمیؒ ج ۱ ص ۱۸۲ باب الاقتداء بالسلف،

رجلاً جاهلاً رأى هذا الثوب لقال ان طلحة بن
عبيد الله قد كان يلبس الثياب المصبغة فی الاحرام
فلا تلبسوا ايها الرهط شيئاً من هذه الثياب المصبغة[1]

"حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رض
کو دیکھا کہ انھوں نے احرام کی حالت میں رنگا ہوا کپڑا پہن رکھا ہے
حضرت عمر رض نے اُن سے کہا، طلحہ! یہ رنگا ہوا کپڑا کیسا؟ حضرت
طلحہ رض نے جواب دیا، امیر المؤمنین! یہ تو گیرو ہے، (جس میں خوشبو
نہیں ہوتی، اور بغیر خوشبو کے رنگین کپڑا پہننا جائز ہے) حضرت
عمر رض نے فرمایا، آپ حضرات امام و مقتدا ہیں، لوگ آپ کی
اقتداء کرتے ہیں، لہٰذا اگر کوئی ناواقف آدمی (آپ کے جسم پر)
یہ کپڑا دیکھے گا تو وہ یہ کہے گا کہ طلحہ بن عبید اللہ رض احرام کی حالت
میں رنگے ہوئے کپڑے پہنا کرتے تھے (لہٰذا ہر قسم کے رنگین کپڑے
پہننا جائز ہے، چنانچہ وہ خوشبو والے رنگین کپڑے بھی پہننے لگیں گے)
لہٰذا آپ حضرات اس قسم کے رنگے ہوئے کپڑے نہ پہنا کریں"

(۷) اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمر رض نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض کو (خاص
قسم کے) موزے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا۔

عزمت عليك ألا نزعتهما، فإنى أخاف أن ينظر
الناس أليك فيقتدون بك[2]،

"میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ اُن کو اتار دو، اس لئے کہ مجھے خوف ہے

---

[1] مسند احمد ج ۱ ص ۱۹۲، احادیث عبدالرحمٰن بن عوف رض، [2] الاستیعاب لابن عبد البر
(تحت الاصابۃ) ج ۲ ص ۳۱۵؛ والاصابہ للحافظ ابن حجر رح ج ۲ ص ۳۶۱ و اعلام الموقعین
لابن قیم ج ۲ ص ۱۷۱)

کہ لوگ تمہیں دیکھیں گے تو تمہاری اقتدا کریں گے۔

مذکورہ بالا تینوں واقعات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ صحابۂ کرامؓ میں سے جو حضرات علم و فقہ میں امتیازی مقام رکھتے تھے، اُن کے صرف اقوال اور فتووں ہی کی نہیں بلکہ ان کے افعال کی بھی تقلید اور اتباع کی جاتی تھی، جس میں دلائل معلوم کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا، اسی وجہ سے یہ حضرات اپنے عمل میں خود بھی بہت محتاط رہتے تھے، اور دوسروں کو بھی محتاط رہنے کی تاکید فرماتے تھے،

(۸) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو کوفہ بھیجا، اور اہل کوفہ کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا:۔

انی قد بعثت الیکم بعمار بن یاسر أمیراً، وعبد اللہ بن مسعود معلماً ووزیراً، وھما من النجباء من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اھل بدر فاقتدوا بھما واسمعوا من قولھما،

"میں نے تمہارے پاس عمار بن یاسرؓ کو امیر بنا کر اور عبداللہ بن مسعودؓ کو معلم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے، اور یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نجباءِ صحابہؓ میں سے ہیں، اور اہل بدر میں سے ہیں، پس تم ان کی اقتدا کرو اور اُن کی بات سنو"

(۹) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ قضاء کے اصول بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

فمن عرض لہ منکم قضاء بعد الیوم فلیقض بما فی کتاب اللہ، فان جاءہ أمر لیس فی کتاب اللہ فلیقض بما قضی بہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم فان جاءہ أمر لیس فی کتاب اللہ ولا قضی بہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم فلیقض بما قضی بہ الصالحون، فان جاءہ امر لیس فی کتاب اللہ ولا قضی بہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا قضی بہ الصالحون فلیجتہد رأیہ،[1] (لہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

"آج کے بعد جس شخص کو قضاء کا معاملہ پیش آئے اسے چاہئے کہ وہ کتاب اللہ سے فیصلہ کرے، پھر اگر اس کے سامنے کوئی ایسا معاملہ آجائے جو کتاب اللہ میں نہیں ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فیصلہ کیا ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے، پھر اگر کوئی ایسا معاملہ آجائے جو نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ ہو تو صالحین نے جو فیصلہ کیا ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے، اور اگر ایسا معاملہ پیش آجائے جو نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہو، اور نہ صالحین نے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے"[1]

اس روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے چار درجے بیان فرمائے ہیں، پہلے قرآن کریم، پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر صالحین کے فیصلے، پھر اجتہاد و قیاس، یہاں جو بات بطور خاص قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اس بات میں کسی بھی ہوش مند کو اختلاف نہیں ہو سکتا، کہ پہلے کتاب اللہ اور پھر سنت کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے سنت سے بالکل قطع نظر کر لی جائے، یعنی کتاب اللہ کا مفہوم صرف اپنی رائے سے معین کیا جائے، اور اگر سنت اس مفہوم کے خلاف نظر آئے تو اُسے چھوڑ دیا جائے، بلکہ باتفاقِ علماء اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اللہ کی تفسیر میں سنت سے کام لیا جائے گا، اور کتاب اللہ کی تشریح سنت کی روشنی میں کی جائیگی، ورنہ کہا جا سکتا ہے کہ زانی کا حکم قرآن میں موجود ہے کہ اس کو سو کوڑے لگائے جائیں، لہٰذا سنت کی طرف رجوع کی ضرورت نہیں، اور رجم کا حکم (معاذ اللہ) کتاب اللہ

---

[1] سنن النسائی ج ۲، ص ۳۰۵ کتاب ادب الاقضیہ، الحکم باتفاق اھل العلم وسنن الدارمی ج ۱ ص ۵۴ مقدمہ، باب الفتیا وما فیہ من الشدۃ،

کے خلاف ہونے کی وجہ سے بے اصل ہے. ظاہر ہے کہ یہ طرزِ استدلال باجماعِ امت غلط ہے.

بالکل اسی طرح صالحین کے فیصلوں کو تیسرے نمبر پر رکھنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ کتاب وسنت کی تشریح کرتے ہوئے صالحین کے فیصلوں سے بالکل قطع نظر کر لی جائے، بلکہ اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ کتاب وسنت کی تشریح صالحین کے فیصلوں کی روشنی میں کی جائے، اور تقلید کا حاصل بھی یہی ہے کہ کتاب وسنت کے جو احکام قطعی طور پر واضح نہ ہوں اُن کے مختلف محتملہ معانی میں سے کسی ایک معنیٰ کو متعین کرنے کے لئے کسی مجتہد کے قول کا سہارا لیا جائے، جیسا کہ پیچھے اس کی تشریح گذر چکی ہے،

پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ حکم اس شخص کو دیا ہے، جسے قضاء کے منصب پر فائز کیا گیا ہو، لہٰذا اس سے یہ معلوم ہوا کہ تقلید صرف جاہل اور اَن پڑھ ہی کا کام نہیں، بلکہ علماء کو بھی اپنی اجتہادی آراء پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنے زیادہ علم رکھنے والے اسلاف کی طرف رجوع کرنا چاہئے، (یہ اور بات ہے کہ ایک بالکل جاہل شخص کی تقلید اور ایک متبحر عالم کی تقلید میں فرق ہوتا ہے، جس کی تشریح آگے آرہی ہے[۱])

(۱۰) حضرت سالم بن عبداللہؒ فرماتے ہیں:-

کان ابن عمرؓ لا یقرأ خلف الامام، قال: فسألت القاسم بن محمد عن ذلک فقال: ان ترکت فقد ترکہ ناسٌ یقتدی بھم وان قرأت فقد قرأہ ناسٌ یقتدی بھم، وکان القاسم ممن لا یقرأ.[۲]

۱؎ مذکورہ بالا تشریح سے علامہ ابن القیمؒ کے ان تمام اعتراضات کا جواب ہو جاتا ہے جو انہوں نے اس روایت سے استدلال پر وارد کئے ہیں. (اعلام الموقعین ج ۲ ص ۱۷۸) ۲؎ موطا امام محمدؒ ص ۹۶ طبع اصح المطابع باب القراءۃ خلف الامام وفیہ اسامۃ بن زید المدنی وثقہ یحیی بن معینؒ وابن عدیؒ وضعفہ بعضہم وقال الحافظؒ فی التقریب صدوق یہم،

"حضرت ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرات نہیں کرتے تھے، تو میں نے
حضرت قاسم بن محمدؒ سے اس بارے میں پوچھا، اس پر انھوں نے
فرمایا: اگر تم (امام کے پیچھے قرات) ترک کردو تو بھی گنجائش ہے)
کیونکہ بہت سے ایسے لوگوں نے قراءت خلف الامام کو ترک کیا ہے
جو قابلِ اقتدا ہیں، اور اگر قرأت کرو تب بھی گنجائش ہے) کیونکہ بہت سے
ایسے لوگوں نے قرأت کی ہے جو قابلِ اقتدا ہیں، اور خود قاسم بن محمدؒ قرات خلف الامام نہیں کرتے تھے"

ملاحظہ فرمایئے! حضرت قاسم بن محمدؒ کبار تابعین اور مدینہ طیبہ کے فقہاءِ سبعہ میں سے ہیں، اور ان کا یہ مقولہ صراحۃً اس پر دلالت کر رہا ہے کہ جہاں دلائل متعارض ہوں وہاں جس کسی امام کی (نیک نیتی کے ساتھ) تقلید کرلی جائے جائز ہے۔

(۱۱) کنز العمال میں طبقات ابن سعدؒ کے حوالے سے روایت ہے:-

عن الحسن انه سأله رجل أتشرب من ماء هذه
السقاية التي في المسجد فانها صدقة، قال الحسن:
قد شرب أبوبكر وعمر من سقاية أم سعد، فمه؟[۱]

"حضرت حسنؒ سے کسی نے پوچھا: کیا آپ مسجد سے پانی پیتے ہیں؟
حالانکہ وہ تو صدقہ کا ہے؟ حضرت حسنؒ نے جواب دیا: حضرت ابوبکرؓ
اور حضرت عمرؓ نے ام سعدؓ کی سبیل سے پانی پیا ہے، تو اگر میں نے
پی لیا تو کیا ہوا؟"

ملاحظہ فرمایئے کہ یہاں حضرت حسنؒ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عمل کے سوا کوئی دوسری دلیل پیش نہیں کی، گویا حضرات شیخینؓ کی تقلید فرمائی،

یہ چند مثالیں سرسری طور سے عرض کردی گئیں، ورنہ کتبِ آثار ایسے واقعات سے لبریز ہیں، علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ:-

والذين حفظت عنهم الفتوى من أصحاب رسول الله
صلى الله عليه وسلم مائة ونيف وثلاثون نفسا مابين

---

[۱] کنز العمال، ج ۳ ص ۳۱۰ کتاب الزکوٰۃ فصل فی المصرف۔

رجل وامرأة،

صحابۂ کرامؓ میں سے جن حضرات کے فتاویٰ محفوظ ہیں اُن کی
تعداد ایک سو تیس سے کچھ اوپر ہے، ان میں مرد بھی داخل ہیں
اور عورتیں بھی[1]

اور صحابۂ کرامؓ کے ان فتووں میں دونوں طریقے رائج تھے، بعض اوقات یہ حضرات فتویٰ کے ساتھ کتاب وسنت سے اس کی دلیل بھی بیان فرماتے، اور بعض اوقات دلیل بتائے بغیر صرف حکم کی نشان دہی فرما دیتے، جس کی چند مثالیں اوپر گذری ہیں اور مزید بہت سی مثالیں مؤطاً امام مالکؒ، کتاب الآثار للامام ابی حنیفہؒ، مصنف عبدالرزاقؒ، مصنف ابن ابی شیبہؒ، شرح معانی الآثار للطحاویؒ اور المطالب العالیۃ للحافظ ابن حجرؒ وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہیں،

تقلیدِ شخصی عہدِ صحابہؓ وتابعینؒ میں

مذکورہ مثالیں تو تقلیدِ مطلق کی تھیں، یعنی ان مثالوں میں صحابہؓ وتابعینؒ نے کسی فردِ واحد کو معیّن کرکے اس کی تقلید نہیں کی، بلکہ کبھی کسی عالم سے مسئلہ پوچھ لیا، اور کبھی کسی اور سے، اسی طرح تقلیدِ شخصی کی بھی متعدد مثالیں ذخیرۂ احادیث میں ملتی ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:-

پہلی نظیر (۱) صحیح بخاریؒ میں حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے:-
ان أهل المدينة سألوا ابن عباس رضي الله عنهما عن امرأة طافت ثم حاضت، قال لهم تنفر، قالوا لا نأخذ بقولك وندع قول زيدٍ[2]

---

[1] اعلام الموقعین، لابن القیمؒ ج ۱ ص ۹، [2] صحیح بخاری، کتاب الحج، باب اذا حاضت المرأۃ بعد ما أفاضت،

"بعض اہلِ مدینہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اُس عورت کے
بارے میں سوال کیا جو طوافِ فرض کے بعد حائضہ ہو گئی ہو،...
(کہ وہ طوافِ وداع کیلئے پاک ہونے تک انتظار کرے یا طوافِ وداع اس سے
ساقط ہو جائے گا؟ اور بغیر طواف کے واپس آنا جائز ہوگا؟)
ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ (طوافِ وداع کے بغیر) جا سکتی ہے، اہلِ
مدینہ نے کہا کہ ہم آپکے قول پر زید بن ثابتؓ کے قول کو چھوڑ کر عمل نہیں کریں گے"

اور یہی روایت معجم اسماعیلیؒ میں عبدالوہاب الثقفی کے طریق سے مروی ہے،
اس میں اہلِ مدینہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:-

لا نبالی أفتیتنا أو لم تفتنا، زید بن ثابتؓ یقول
لا تنفر[1]

"ہمیں پروا نہیں کہ آپ فتویٰ دیں یا نہ دیں، زید بن ثابتؓ
کا قول یہ ہے کہ وہ (طوافِ وداع کے بغیر) نہیں جا سکتی"

اور یہی واقعہ مسند ابوداؤد طیالسیؒ بروایت قتادہؒ منقول ہے، اس میں
اہلِ مدینہ کے یہ الفاظ مروی ہیں:-

لا نتابعک یا ابن عباسؓ وانت تخالف زیداً، فقال
سلوا صاحبتکم أم سلیمؓ[2]

"اے ابن عباسؓ! جس معاملے میں آپ حضرت زید بن ثابتؓ
کی مخالفت کر رہے ہیں اس میں ہم آپ کی اتباع نہیں کرینگے
اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ (مدینہ پہنچ کر) اُم سلیمؓ
سے پوچھ لینا (کہ جو جواب میں نے دیا ہے وہ درست ہے)"

---

[1] فتح الباری ج ۳ ص ۴۶۸ طبع میریہ ۱۳۰۰ھ و عمدۃ القاری ج ۴ ص ۷۷۷،
[2] مسند ابوداؤد الطیالسیؒ ص ۲۲۹ مرویات ام سلیمؓ،

اس واقعے میں اہلِ مدینہ اور حضرت ابن عباسؓ کی گفتگو سے دو باتیں وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں، ایک تو یہ کہ یہ اہلِ مدینہ حضرت زید بن ثابتؓ کی تقلیدِ شخصی کیا کرتے تھے، اور اُن کے قول کے خلاف کسی کے قول پر عمل نہیں کرتے تھے، بلکہ معجم اسماعیلیؒ کی روایت سے تو یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اپنے فتوے کی دلیل میں حضرت اُمّ سلیمؓ وغیرہ کی احادیث بھی سنائی تھیں[1] اس کے باوجود چونکہ ان حضرات کو حضرت زیدؓ کے علم پر پورا اعتماد تھا اس لئے انھوں نے اپنے حق میں انہی کے قول کو حجت سمجھا، اور حضرت ابن عباسؓ کے فتوے پر عمل نہ کرنے کی اس کے سوا کوئی وجہ بیان نہیں کی کہ وہ حضرت زیدؓ کے فتوے کے خلاف ہے،

دوسرے یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی ان حضرات پر یہ اعتراض نہیں فرمایا کہ تم تقلید کے لئے ایک شخص کو معین کرکے "گناہ" یا "شرک" کے مرتکب ہو رہے ہو، بلکہ انھیں حضرت اُمّ سلیمؓ سے مسئلہ کی تحقیق کرکے حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف دوبارہ مراجعت کرنے کی ہدایت فرمائی، چنانچہ یہ حضرات مدینہ طیبہ پہنچے، تو انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ارشاد کے مطابق اُمّ سلیمؓ سے واقعہ کی تحقیق کرکے دوبارہ حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف مراجعت کی، جس کے نتیجے میں حضرت زیدؓ نے مکرر حدیث کی تحقیق فرما کر اپنے سابقہ فتوے سے رجوع فرما لیا، اور اس کی اطلاع حضرت ابن عباسؓ کو بھی دی، جیسا کہ مسلمؒ، نسائیؒ اور بیہقیؒ وغیرہ کی روایات میں تصریح ہے[2]،

بعض حضرات نے اس استدلال کے جواب میں یہ فرمایا ہے کہ اگر اہلِ مدینہ مقلد ہوتے تو حضرت اُمّ سلیمؓ کی حدیث کی تحقیق کیوں کرتے؟[3] لیکن یہ جواب اس

---

[1] کیونکہ حضرت زید بن ثابتؓ کے رجوع کے بعد جب اہلِ مدینہ کی ملاقات حضرت ابن عباسؓ سے ہوئی تو انھوں نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ وجدنا الحدیث کما حدثتنا (عمدۃ القاری حوالہ بالا) [2] فتح الباری، ج ۳ ص ۴۶۸ و ۴۶۹ [3] "تحریکِ آزادیِ فکر" از مولانا محمد اسمٰعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ، ص ۱۳۶،

غلط فہمی پر مبنی ہے کہ کسی مجتہد کی تقلید کرنے کے بعد احادیث کی تحقیق حرام ہو جاتی ہے، غیر مقلد حضرات کے بیشتر دلائل اور اعتراضات اسی غلط مفروضے پر مبنی ہیں، حالانکہ جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے، تقلید کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ جو شخص براہِ راست قرآن و حدیث کا مطلب سمجھنے، ان کے ظاہری تعارض کو رفع کرنے، یا ناسخ و منسوخ وغیرہ کا فیصلہ کرنے کی اہلیت اپنے اندر نہیں پاتا وہ کسی مجتہد سے تفصیلی دلائل کا مطالبہ کئے بغیر اس کے علم پر اعتماد اور اس کے فتوے پر عمل کر لیتا ہے، لہٰذا تقلید کے مفہوم میں یہ بات ہرگز داخل نہیں ہے کہ مجتہد کے فتوے پر عمل کرنے کے بعد قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کی جائے، بلکہ یہ دروازہ تقلید کے بعد بھی کھلا رہتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں مقلدین نے کسی امام کی تقلیدِ شخصی کرنے کے باوجود قرآن کریم کی تفسیریں اور احادیث کی شروح لکھی ہیں، اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے علم کو بڑھانے اور تحقیق و نظر کا سلسلہ جاری رکھا ہے، اور اگر اس تحقیق کے دوران کسی مسئلے میں قطعی طور سے واضح ہو گیا ہے کہ کوئی حدیثِ صریح مجتہد کے قول کے خلاف ہے، اور اس کے معارض کوئی قوی دلیل موجود نہیں، تو اُس مسئلے میں اپنے امام کے بجائے حدیثِ صریح پر عمل کیا ہے، جس کی پوری تحقیق و تفصیل آگے آرہی ہے، لہٰذا اگر کبھی مقلد کو اپنے امام کا کوئی قول کسی حدیث کے خلاف معلوم ہوتا ہے تو اُس حدیث کی تحقیق کرنا تقلید کے خلاف نہیں ہے، اور مذکورۂ بالا حدیث میں تو تحقیق اور تقلید دونوں کا پورا پورا موقع موجود تھا، کیونکہ حضرت زید بن ثابتؓ بقیدِ حیات تھے، اور وہ اس حدیث کی تحقیق کرنے کے بعد اس تحقیق کے نتائج سے اُن کو مطلع کر سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، اور بالآخر حضرت زید بن ثابتؓ نے بھی اپنے قول سے رجوع فرما لیا، اور اس طرح حضرت زید بن ثابتؓ کے یہ مقلدین حدیث کی مخالفت سے بھی بچ گئے اور اپنے امام کی مخالفت سے بھی،

لیکن زیر بحث مسئلے میں جو بات بطورِ خاص قابلِ توجہ ہے وہ ان حضرات کا؟

جملہ ہے کہ: "ہم زیدؓ کے قول کو چھوڑ کر آپ کے قول پر عمل نہیں کر سکتے" یہ اگر تقلید شخصی نہیں ہے تو اور کیا ہے!

دوسری نظیر (۲) صحیح بخاریؒ وغیرہ میں حضرت ھزیل بن شرحبیلؒ سے ایک واقعہ مروی ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے کچھ لوگوں نے ایک مسئلہ پوچھا، انھوں نے جواب تو دیدیا، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی پوچھ لو، چنانچہ وہ لوگ حضرت ابن مسعودؓ کے پاس گئے، اور ان سے بھی وہ مسئلہ پوچھا، اور ساتھ ہی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی رائے بھی ذکر کردی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جو فتویٰ دیا وہ حضرت ابو موسیٰؓ کے فتوے کے خلاف تھا، لوگوں نے حضرت ابو موسیٰؓ سے حضرت ابن مسعودؓ کے فتویٰ کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا:-

لا تسألونی مادام ھٰذا الحبر فیکم،

"جب تک یہ متبحر عالم (یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ) تمھارے درمیان موجود ہیں اس وقت تک مجھ سے مسائل نہ پوچھا کرو۔"

اور مسند احمدؒ وغیرہ کی روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ:-

لا تسألونی عن شیٔ مادام ھٰذا الحبر بین أظھرکم،

"یعنی جب تک یہ متبحر عالم تمھارے درمیان موجود ہیں مجھ سے کچھ نہ پوچھا کرو"[1]

ملاحظہ فرمائیے! یہاں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اس بات کا مشورہ دے رہے ہیں کہ جب تک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ زندہ ہیں اس وقت تک تمام مسائل انہی سے پوچھا کرو، اور اسی کا نام تقلیدِ شخصی ہے،

بعض حضرات نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حضرت ابو موسیٰؓ نے حضرت

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابنۃ ابن مع ابنۃ ج ۲ ص ۹۹۷ ومسند احمد ج ۱ ص ۴۶۴، احادیث عبداللہ بن مسعودؓ،

ابن مسعودؓ کے ہوتے ہوئے اپنی تقلید سے تو منع فرمادیا، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انھوں نے دوسرے صحابہؓ کی طرف رجوع سے بھی منع کردیا ہو، اس وقت اکابر صحابہؓ موجود تھے، وہ ان کی طرف رجوع سے کیسے روک سکتے تھے! غایت یہی ہوسکتی ہے کہ افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی طرف رجوع نہ کیا جائے[1]،

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سارا واقعہ کوفہ میں پیش آیا ہے جہاں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سب سے بڑے عالم تھے، اور حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں پیش آیا ہے،[2] جبکہ حضرت علیؓ بھی کوفہ تشریف نہیں لائے تھے، اور اُس وقت وہاں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے بڑا عالم باتفاق کوئی نہیں تھا، لہٰذا اگر حضرت ابوموسیٰؓ کے ارشاد کی علت یہی ہو کہ "افضل کے ہوتے ہوتے مفضول کی طرف رجوع نہ کیا جائے" تب بھی اس کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ جبتک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ موجود ہیں اُس وقت تک صرف انہی سے مسائل پوچھتے رہو، انھیں چھوڑ کر میری یا کسی اور کی طرف رجوع نہ کرو، کیونکہ کوفہ میں اُن سے افضل عالم کوئی نہیں، چنانچہ معجم طبرانی میں ہے کہ رضاعت کے ایک مسئلے میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی طرف رجوع کیا گیا تو اُس وقت بھی انھوں نے یہی بات ارشاد فرمائی، بلکہ وہاں الفاظ یہ ہیں کہ:-

لا تسألونی عن شئ ما أقام هذا ابن أظهرنا من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم[3]

"مجھ سے کسی معاملہ میں سوال نہ کیا کرو جب تک کہ یہ (ابن مسعودؓ) صحابہ میں سے ہمارے درمیان موجود ہیں"

لہٰذا جن حالات اور جس ماحول میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے یہ

---

[1] تحریکِ آزادیِ فکر، ص ۱۳۸ [2] عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۹۸ و فتح الباری ص ۱۲/۱۴۷
[3] مجمع الزوائد ج ۴ ص ۲۶۲ باب الرضاع، یہی روایت کنز العمال ج ۶ ص ۱۴۷ میں بحوالہ عبدالرزاق آئی ہے، وہاں یہ جملہ بھی ہے: واللہ لا أفتیکم ماکان بھا،

بات ارشاد فرمائی ہے، اس میں بہ خالص تقلید شخصی کا مشورہ ہے، اور اس سے یہ بات بلاشبہ واضح ہوتی ہے کہ تقلید شخصی عہدِ صحابہؓ میں کوئی شجرۂ ممنوعہ نہیں تھی۔

تیسری نظیر

(۳) جامع ترمذیؒ اور سننِ ابو داؤدؒ وغیرہ میں حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث منقول ہے :-

عن معاذ بن جبلؓ أنّ رسول الله صلى الله عليه وسلم لما بعثه إلى اليمن، قال: كيف تقضي إذا عرض لك قضاء؟ قال أقضي بكتاب الله، قال فإن لم تجد في كتاب الله؟ قال فبسنّة رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فإن لم تجد في سنّة رسول الله ولا في كتاب الله؟ قال: أجتهد رأيي، ولا آلو، فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم صدره، فقال: الحمد لله الذي وفق رسولَ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم لما يرضي رسولَ الله[1]

"حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن بھیجا تو فرمایا کہ جب کوئی قضیہ تمہارے سامنے پیش آئے گا تو کس طرح فیصلہ کروگے؟ عرض کیا کہ کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا، فرمایا اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ہو؟ تو عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے فیصلہ کروں گا، آپؐ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ اور سنت دونوں میں نہ ملے؟ عرض کیا اس وقت اپنی رائے سے اجتہاد و استنباط کروں گا، اور (حق تک پہنچنے کی کوشش میں) کوتاہی نہیں کروں گا، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (فرطِ مسرت سے) حضرت معاذؓ کے سینے پر

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، باب اجتہاد الرأی فی القضاء،

اپنا دست مبارک مارا اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے، اس نے اللہ کے رسولؐ
کے اس قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔"

یہ واقعہ تقلید و اجتہاد کے مسئلہ میں ایک ایسی شمع ہدایت ہے کہ اس پر جتنا غور کیا جائے اس مسئلہ کی گتھیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں، یہاں ہمیں اس واقعہ کے صرف ایک پہلو پر توجہ دلانا مقصود ہے، اور وہ یہ کہ آپؐ نے اہلِ یمن کے لئے اپنے فقہاء صحابہؓ میں سے صرف ایک جلیل القدر صحابی کو بھیجا، اور انھیں حاکم و قاضی، اور معلّم و مجتہد بنا کر اہلِ یمن پر لازم کر دیا کہ وہ اُن کی اتباع کریں، انھیں صرف قرآن و سنت ہی نہیں بلکہ قیاس و اجتہاد کے مطابق فتویٰ صادر کرنے کی اجازت عطا فرمائی، اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپؐ نے اہلِ یمن کو اُن کی تقلیدِ شخصی کی اجازت دی، بلکہ اسکو ان کے لئے لازم فرما دیا۔[1]

---

[1] ناچیز کے اس استدلال پر ایک صاحب نے جو ناچیز اور تمام مقلد علماء کو کافر و مشرک کہتے ہیں لکھا کہ "حدیث پیش کرنے سے پہلے یہ تو دیکھ لیا ہوتا کہ حدیث صحیح بھی ہے یا نہیں" (التحقیق فی جواب التقلید ص ۴۹) اور اس کے بعد ابوداؤد کے حاشیہ سے وہی مشہور اعتراضات نقل کر دیتے ہیں جو علامہ جوزقانیؒ نے اس حدیث پر وارد کئے ہیں، اوّل تو موصوف تقلید کی تردید فرماتے ہوئے خود تقلید کے مرتکب ہوتے ہیں، کہ حدیث کو رَد کرنے کے لئے صرف امام جوزقانیؒ کے قول کو کافی سمجھا ہے، دوسرے موصوف نے صرف ابوداؤد کا حاشیہ دیکھ لینا حدیث کی تحقیق کے لئے کافی سمجھا، اگر وہ کسی اور کی نہیں علامہ ابن القیمؒ ہی کی تحقیق دیکھ لیتے تو یہ شبہات رفع ہو جاتے، علّامہ ابن القیمؒ نے امام جوزقانیؒ کے اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے، اور بتایا ہے کہ حضرت معاذؓ کے جن اصحاب سے یہ حدیث مروی ہے ان میں کوئی بھی متہم، کذّاب یا مجروح نہیں ہے، دوسرے انھوں نے خطیب بغدادیؒ کے حوالہ سے اسی حدیث کا ایک دوسرا طریق "عبادة بن نسی عن عبد الرحمٰن بن غنم عن معاذؓ" بھی ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے "وھذا اسناد متصل ورجالہ معروفون بالثقة" نیز بتلایا ہے کہ یہ حدیث اُمت کی تلقی بالقبول کی وجہ سے بھی قابلِ استدلال ہے، (دیکھئے اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۷۵ و ۱۷۶)

حضرت معاذؓ صرف ایک مسندِ حکمران بنکر یمن تشریف نہیں لے گئے تھے، بلکہ ایک معلّم اور مفتی کی . . حیثیت سے بھی تشریف لے گئے تھے، لہٰذا یہ خیال درست نہیں ہے کہ "اس حدیث کا تعلق حکم اور قضاء سے ہے افتاء سے نہیں"[1] صحیح بخاریؒ کی روایت ہے:

عن الأسود بن یزیدؒ قال أتانا معاذ بن جبلؓ بالیمن معلماً أو أمیراً، فسألناه عن رجل توفی وترك ابنته وأخته فأعطى الابنة النصف والأخت النصف[2]

"حضرت اسود بن یزیدؒ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ ہمارے پاس یمن آئے وہ ہمارے امیر بھی تھے اور معلّم بھی تھے، ہم نے ان سے یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص نے وفات کے بعد اپنی بیٹی اور بہن چھوڑی ہے، (اُن کو کیا میراث ملے گی؟) تو حضرت معاذؓ نے بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف میراث دی۔"

یہاں حضرت معاذؓ نے بحیثیت ایک مفتی کے فتویٰ دیا، اور اس کی دلیل بھی بیان نہیں فرمائی، اور اسے تقلیداً قبول کیا گیا، پھر اس واقعہ میں تو حضرت معاذؓ نے اگرچہ دلیل بیان نہیں فرمائی، لیکن اُن کا فیصلہ کتاب وسنت پر مبنی تھا، ایک اور فتویٰ ملاحظہ فرمایئے، جس کی بنیاد حضرت معاذؓ کے اجتہاد واستنباط پر تھی:-

عن أبی الأسود الدیلی قال کان معاذؓ بالیمن فارتفعوا إلیه فی یهودی مات وترك أخا مسلما فقال معاذؓ إنی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول إن الإسلام یزید ولا ینقص فورثه[3]،

---

[1] تحریک آزادیٔ فکر از حضرت مولانا محمد اسمٰعیل سلفیؒ، ص ۱۴۰ [2] صحیح بخاریؒ، کتاب الفرائض باب میراث البنات، ج ۲ ص ۹۹۷، [3] مسند احمدؒ ج ۵، ص ۲۳۰ و ۲۳۶ وأخرجه الحاکمؒ وقال "صحیح الاسناد لم یخرجاه" وقال الذهبیؒ "صحیح" (مستدرک حاکمؒ ج ۴ ص ۳۴۵)

"حضرت ابوالاسود دیلیؒ فرماتے ہیں کہ معاذؓ یمن میں تھے، لوگ ان کے پاس یہ مسئلہ لے گئے کہ ایک یہودی اپنے پیچھے اپنا ایک مسلمان بھائی چھوڑ کر مرگیا ہے، (آیا اس کا... مسلمان بھائی وارث ہوگا یا نہیں؟) حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ اسلام زیادتی کرتا ہے کمی نہیں کرتا (لہٰذا میرے نزدیک مسلمان ہونے کی بناء پر یہودی کے بھائی کو میراث سے محروم نہیں کیا جائے گا) چنانچہ حضرت معاذؓ نے اسے میراث دلوائی"[1]

ملاحظہ فرمائیے! یہاں حضرت معاذؓ نے ایک ایسی دور کی حدیث سے استدلال فرمایا جس کا موضوع وراثت کے مسائل نہیں ہیں، یہ محض ان کا اجتہاد تھا، اور اہل یمن نے اُسے قبول کیا،

نیز مسند احمدؒ اور معجم طبرانیؒ میں روایت ہے کہ :-

إن معاذا اقدم اليمن فلقيته امرأة من خولان . . . فقامت فسلمت على معاذ . . . فقالت : من أرسلك أيها الرجل ؟ قال لها معاذ : ارسلني رسول الله صلى الله عليه وسلم، قالت المرأة أرسلك رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنت رسول رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فلا تخبرني يا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال لها معاذ: سليني عما شئت[2]،

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یمن تشریف لائے تو خولان کی ایک عورت

---

[1] واضح رہے کہ یہ حضرت معاذؓ کا اپنا استنباط تھا، ورنہ جمہور صحابہؓ اور فقہاء کے نزدیک مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا، لقولہ علیہ السلام "لا یرث المسلم الکافر" [2] اوردہ الہیثمیؒ فی مجمع الزوائد ج۴، ۳۰۷ و ۳۰۸ باب حق الزوج علی المرأۃ، وقال: رواہ احمد والطبرانی من روایۃ عبدالحمید بن بہرام عن شہر وفیہا ضعف وقد وثقا،

اُن کے پاس آئی اور سلام کے بعد کہنے لگی کہ اے شخص! تمہیں کس نے
بھیجا ہے! حضرت معاذ رضؓ نے فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے بھیجا ہے، عورت نے کہا: آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا
ہے، اور آپ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایلچی ہیں، تو اے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیامبر! کیا آپ مجھے (دین کی باتیں)
نہیں بتائیں گے؟ حضرت معاذ رضؓ نے فرمایا: مجھ سے جو چاہو پوچھو"

اس حدیث سے واضح ہے کہ حضرت معاذ رضؓ کو محض ایک گورنر کی حیثیت میں نہیں بھیجا گیا تھا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر اور نمائندے کی حیثیت میں اُن کا فریضۂ منصبی یہ بھی تھا کہ لوگ اُن سے دین کے احکام معلوم کریں اور وہ انھیں بتائیں، چنانچہ اسی حیثیت کا واسطہ دے کر مذکورہ خاتون نے اُن سے سوالات کئے، اور اسی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت معاذ رضؓ نے فرمایا کہ مجھ سے جو چاہو پوچھو، چنانچہ اسی حدیث میں آگے بیان کیا گیا ہے کہ اُس خاتون نے یہ معلوم کیا کہ بیوی پر شوہر کے کیا حقوق ہیں؟ اس کے جواب میں حضرت معاذ رضؓ نے کوئی آیت یا حدیث نہیں سنائی، بلکہ اصولِ اسلام کے مطابق جواب دیا، اور اس کی کوئی دلیل بیان نہیں فرمائی، اس سے اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ محض قضا اور انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے نہیں گئے تھے، بلکہ اُن کو اس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے کی حیثیت میں لوگوں کو احکامِ شریعت سے باخبر کریں، اور لوگ اُن کی تقلید کریں،

پھر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "اَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ" (صحابۂ کرام رضؓ میں حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم) قرار دیا[1]، اور جن کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا کہ:

---

[1] رواه النسائی رحؒ والترمذی رحؒ وابن ماجہ رحؒ باسانید صحیحۃ حسنۃ، وقال الترمذی: ہو حدیث حسن صحیح (تہذیب الاسماء واللغات للنووی رحؒ ج ۱ ص ۹۹) -

إنه يحشر يوم القيامة بين يدي العلماء نبذة[۵۱]

"اُن کو قیامت کے دن اس طرح اٹھایا جائے گا کہ یہ علماء کی قیادت کرتے ہوئے ان سے اتنے آگے ہوں گے جتنی دور تک ایک تیر جاتا ہے"

چنانچہ صرف اہل یمن ہی نہیں، بلکہ دوسرے صحابہؓ بھی اُن کی تقلید کرتے تھے:۔

عن أبي مسلم الخولاني قال أتيت مسجد أهل دمشق فإذا حلقة فيها كهول من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم (وفي رواية كثير بن هشام: فإذا فيه نحو ثلاثين كهلاً من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم) وإذا شاب فيهم أكحل العينين براق الثنايا، كلما اختلفوا في شئ ردوه إلى الفتى فتى شاب، قال، قلت لجليس لي: من هذا؟ قال، هذا معاذ بن جبل رض[۵۲]،

"ابومسلم خولانی رح کہتے ہیں کہ اہل دمشق کی مسجد میں آیا تو دیکھا کہ وہاں ایک حلقہ ہے جس میں ادھیڑ عمر کے صحابۂ کرامؓ موجود ہیں (ایک روایت میں ہے کہ ان صحابہؓ کی تعداد تیس کے لگ بھگ تھی[۵۳]) انہی میں میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان ہے جس کی آنکھیں سُرمگیں اور سامنے کے دانت چمکدار ہیں، جب ان صحابہؓ کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف رائے ہوتا تو وہ اس کا فیصلہ اسی نوجوان سے کراتے، میں نے اپنے ایک ہمنشین سے پوچھا یہ کون ہیں؟ اس نے جواب دیا، یہ معاذ بن جبلؓ ہیں"۔

ملاحظہ فرمائیے کہ تیس کے قریب صحابۂ کرامؓ اختلافی مسائل میں حضرت معاذؓ

---

۵۱ اخرجہ احمدؒ فی مسندہ عن عمرؓ وفی روایۃ "برتوۃ" والرتوۃ والنبذۃ کلاھما رمیۃ سہم (الفتح الربانی ج ۲۱ ص ۳۵۲) ۵۲ مسند احمدؒ ج ۵ ص ۲۳۶، مرویات معاذ بن جبلؓ،

۵۳ ایضاً ج ۵ ص ۲۳۹،

کی پیروی کرتے تھے، ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ: "اذا اختلفوا فی شیٔ أسندوہ إلیہ وصدروا عن رأیہ[1]" (یعنی جب کسی معاملے میں ان کا اختلاف ہوتا تو وہ اس کا فیصلہ حضرت معاذ رضؓ کے حوالے کر دیتے، اور ان کی رائے قبول کر کے لوٹتے)

خلاصہ یہ کہ حضرت معاذ بن جبلؓ اُن فقہاء صحابہؓ میں سے ہیں، جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "اعلم بالحلال والحرام" قرار دیا، اور خود صحابۂ کرامؓ جن کی تقلید کرتے تھے، لہٰذا جب آپؐ نے اُن کو یمن روانہ فرمایا اور انھیں قضاء سے لیکر تعلیم و افتاء تک تمام ذمہ داریاں سونپیں، تو اہلِ یمن پر لازم فرما دیا کہ وہ اپنے تمام دینی معاملات میں انہی کی طرف رجوع کیا کریں، چنانچہ اہل یمن نے ایسا ہی کیا، اور اسی کا نام تقلیدِ شخصی ہے،

چوتھی نظیر

(۴) سنن ابوداؤدؒ میں روایت ہے:-

عن عمرو بن میمون الأودی قال قدم علینا معاذ بن جبلؓ الیمن رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إلینا، قال، فسمعت تکبیرہ مع الفجر رجل أجش الصوت، قال، فالقیت محبتی علیہ، فما فارقتہ حتی دفنتہ بالشام میتًا، ثم نظرت إلی أفقہ الناس بعدہ فأتیت ابن مسعودؓ فلزمتہ حتی مات[2]

"حضرت عمرو بن میمون الأودیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ ہمارے پاس یمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر بنکر آئے، فرماتے ہیں کہ میں نے نمازِ فجر میں اُن کی تکبیر سُنی، وہ بھاری آواز والے تھے، میرے دل میں قدرت کی طرف سے اُن کی محبت پیوست کر دی گئی،

---

[1] مسند احمدؒ ج ۵ ص ۲۳۲ مرویات معاذ بن جبلؓ، [2] ابوداؤد، باب اذا آخر الامام الصلوٰۃ عن الوقت ج ۱ ص ۶۲، و مسند احمدؒ ج ۵ ص ۲۳۱،

اس کے بعد میں اُن سے اُس وقت تک جدا نہیں ہوا جبتک اُن کا...
انتقال نہیں ہوگیا، اور انھیں میں نے شام میں دفن نہیں کر دیا، پھر
میں نے دیکھا کہ ان کے بعد سب سے بڑے فقیہ کون ہیں ؟ تو میں حضرت
ابن مسعودؓ کے پاس آیا اور انہی کے ساتھ لگا رہا، یہاں تک کہ اُن کی
وفات ہوگئی "

اس روایت میں حضرت عمرو بن میمونؒ کا یہ فرمانا کہ "حضرت معاذؓ کی وفات کے بعد میں نے دیکھا کہ سب سے بڑا فقیہ کون ہے ؟" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے حضرت معاذؓ اور پھر حضرت ابن مسعودؓ کے پاس اُن کا مسلسل رہنا ان سے مسائل فقہ معلوم کرنے کے لئے تھا، لہٰذا جبتک حضرت معاذؓ کی صحبت میسر رہی اس وقت تک وہ فقہی مسائل میں صرف انہی کی طرف رجوع کرتے رہے، ان کی وفات کے بعد حضرت ابن مسعودؓ افقہ نظر آئے، اس لئے اُن کی طرف رجوع فرمایا، لہٰذا ایک وقت میں صرف ایک فقیہ سے رجوع کرنا تقلیدِ شخصی کی واضح نظیر ہے،

چند متفرق نظیریں

(۵) اسی طرح بہت سے حضراتِ تابعینؒ سے منقول ہے کہ ان میں سے کسی نے کسی صحابی کو اپنا مقتدا بنایا ہوا تھا، اور کسی نے دوسرے صحابی کو، چند مثالیں درج ذیل ہیں :۔

امام شعبیؒ فرماتے ہیں :۔

من سرہ أن یأخذ بالوثیقة فی القضاء فلیأخذ
بقول عمرؓ[1]

(۶) حضرت مجاہدؒ کا قول ہے :۔

اذا اختلف الناس فی شیٔ فانظروا ما صنع عمر
فخذوا بہ[2]،

"جب لوگوں کے درمیان کسی مسئلے میں اختلاف ہو تو یہ دیکھو کہ حضرت
عمرؓ کا عمل کیا تھا، بس اسی کو اختیار کرلو "

---

[1] اعلام الموقعین لابن القیمؒ ج ۱ ص ۱۵ [2] ایضاً حوالۂ مذکور،

(۷) امام اعمشؒ حضرت ابراہیم نخعیؒ کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

انہ کان لایعدل بقول عمرؓ وعبداللہؓ اذا اجتمعا، فاذا اختلفا کان قول عبداللہؓ أعجب إلیہ،[1]

"جب حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کسی مسئلے میں متفق ہوں تو حضرت ابراہیم نخعیؒ اُن کی برابر کسی کے قول کو نہیں سمجھتے تھے اور جب ان دونوں میں اختلاف ہوتا تو ان کو حضرت عبداللہؓ کا قول اختیار کرنا زیادہ پسند آتا"

(۸) حضرت ابوتمیمہؒ کہتے ہیں :۔

قدمنا الشام فاذا الناس مجتمعون یطیفون برجل، قال، قلت من ھذا؟ قالوا ھذا افقہ من بقی من أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ھذا عمرو البکالیؓ،[2]

"ہم شام آئے تو دیکھا کہ لوگ ایک صاحب کے پاس جمع ہیں، اور ان کے اردگرد پھرتے ہیں، میں نے پوچھا، یہ کون صاحب ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ باقی ماندہ صحابہ کرامؓ میں سب سے بڑے فقیہ ہیں، یعنی عمرو البکالیؓ ہیں"

(۹) امام محمد بن جریر طبریؒ فرماتے ہیں :۔

لم یکن أحد لہ أصحاب معروفون حرروا فتیاہ ومذاھبہ فی الفقہ غیر ابن مسعودؓ، وکان یترک مذھبہ وقولہ لقول عمرؓ، وکان لا یکاد یخالفہ فی شیٔ من مذاھبہ، ویرجع من قولہ إلی قولہ، وقال الشعبی کان عبداللہ لا یقنت، وقال: ولو قنت عمر لقنت عبداللہؓ[3]

---

[1] اعلام الموقعین لابن القیمؒ، ج ۱ ص ۱۳ و ۱۴، [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۴ [3] ایضاً ج ۱ ص ۱۶،

(صحابۂ کرامؓ میں) کوئی صاحب ایسے نہیں ہیں جن کے اتنے مشہور شاگرد ہوں، اور جن کے فتاویٰ اور فقہی مذاہب کو اس طرح مدوّن کیا گیا ہو سوائے ابن مسعودؓ کے، اس کے باوجود وہ (یعنی حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ) اپنا مذہب اور اپنا قول حضرت عمرؓ کے مقابلے میں چھوڑ دیتے تھے، اور حضرت عمرؓ کے مذاہبِ فقہ میں سے کسی کی مخالفت تقریباً بالکل نہیں کرتے تھے، اور حضرت عمرؓ کا قول آجاتا تو اپنے قول سے رجوع کر لیتے، اور امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ قنوت نہیں پڑھتے تھے، اور اگر حضرت عمرؓ نے قنوت پڑھا ہوتا تو حضرت عبداللہؓ بھی ضرور قنوت پڑھتے۔"

یہ تمام مثالیں تقلید شخصی کی نظیر ہیں، البتہ تقلید کرنے والے کے لحاظ سے تقلید کے مختلف درجات ہوتے ہیں، ان درجات کے لحاظ سے بعض اوقات ایک شخص اپنے امام کا مقلد ہوتے ہوئے بھی بعض مسائل میں اس سے اختلاف کرتا ہے، اور اس کے باوجود بحیثیتِ مجموعی اس کی تقلید شخصی ہی کہلاتی ہے، مثلاً بہت سے مسائل میں مشائخ حنفیہ نے امام ابوحنیفہؒ کے قول کے خلاف فتویٰ دیا ہے، لیکن پھر بھی وہ امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہی کہلاتے ہیں، اس مسئلے کی پوری تفصیل "تقلید کے مختلف درجات" کے عنوان کے تحت ان شاء اللہ آگے آرہی ہے، لہٰذا ان مثالوں کے جواب میں علّامہ ابن القیمؒ وغیرہ نے مذکورہ بالا صحابہؓ و تابعین کے جن فقہی اختلافات کا حوالہ دیا ہے[۱] ان سے ہمارا استدلال متاثر نہیں ہوتا،[۲]

---

[۱] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۱۷۰ [۲] علّامہ ابن القیمؒ نے تقلید کے خلاف جو طویل بحث کی ہے اور جواز تقلید کے جواز پر جو اعتراضات کئے ہیں اُن کے ایک ایک جزء کے مفصل... اور اطمینان بخش جواب کے لئے ملاحظہ ہو "انہاء السکن" (مقدمہ اعلاء السنن) ج ۲ ص ۴۴ تا ۶۹ الفائدۃ الثالثہ، مؤلفہ مولانا حبیب احمد کیرانویؒ، طبع کراچی ۱۳۸۵ھ

غرض مندرجہ بالا روایات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ تقلید کی دونوں قسموں (شخصی اور غیر شخصی) پر صحابۂ کرام کے عہدِ مبارک میں عمل ہوتا رہا ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ جو شخص قرآن وسنت سے براہِ راست احکام مستنبط کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اصل کے اعتبار سے اس کے لئے تقلید کی دونوں قسمیں جائز اور درست تھیں۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

ولیس محله فیمن لا یدین الا بقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولا یعتقد حلالاً الا ما أحله اللہ ورسوله ولا حراماً الا ما حرمه اللہ ورسوله لکن لما لم یکن له علم بما قاله النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولا بطریق الجمع بین المختلفات من کلامه ولا بطریق الاستنباط من کلامه اتبع عالماً راشداً علی أنه مصیب فیما یقول ویفتی ظاهراً متبع سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فإن خالف ما یظنه أقلع من ساعته من غیر جدال ولا إصرار فهذا کیف ینکره أحد مع أن الاستفتاء والافتاء لم یزل بین المسلمین من عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولا فرق بین أن یستفتی هذا دائماً، أو یستفتی هذا حیناً وذلک حیناً بعد ان یکون مجمعاً علی ما ذکرناه[1]

"اور (تقلید کی مذمت میں جو باتیں کہی گئی ہیں) اُن کا اطلاق اس شخص پر نہیں ہوتا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کے قول کو حجت نہیں مانتا اور جس کا اعتقاد یہ ہو کہ حلال صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسول نے حلال کر دیا، اور حرام صرف وہ ہو جسے اللہ اور اس کے رسول نے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۶ مطبوعہ مکتبۂ سلفیہ لاہور ۱۳۹۵ھ و عقد الجید ص ۳۹ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۴۴ھ

حرام کر دیا، لیکن چونکہ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کا علم نہیں ہو، نہ وہ آپ کے کلام میں سے متعارض احادیث کی تطبیق کے طریقے سے واقف ہو، اور نہ آپ کے کلام سے استنباطِ احکام کے طریقے جانتا ہے، اس لئے وہ کسی ہدایت یافتہ عالم کی اس بنا پر اتباع کر لیتا ہے کہ یہ عالم (اپنے علم و تقویٰ کے پیشِ نظر) اپنے اقوال میں صائب ہو گا اور ظاہری طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا متبع ہو گا، چنانچہ اگر اس کا یہ گمان غلط ثابت ہو جائے تو وہ کسی جدال و اصرار کے بغیر اس کی تقلید سے دستبردار ہو جائے گا، تو اس (قسم کی تقلید) سے کوئی کیسے انکار کر سکتا ہے، جبکہ فتویٰ پوچھنے اور فتویٰ دینے کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے چلا آتا ہے، اور (جب کسی سے فتویٰ پوچھنا جائز ہوا تو) اس میں کوئی فرق نہیں کہ انسان ہمیشہ ایک ہی شخص سے فتویٰ پوچھا کرے (جسے تقلیدِ شخصی کہتے ہیں) یا کبھی ایک شخص سے اور کبھی دوسرے شخص سے پوچھا کرے (جسے تقلید مطلق کہتے ہیں)، جبکہ اس میں مذکورہ بالا شرائط جمع ہوں۔"

تقلیدِ شخصی کی ضرورت

لہٰذا "تقلید" پر عمل کرنے کے لئے تقلیدِ مطلق یا تقلیدِ شخصی میں سے جس صورت پر بھی عمل کر لیا جائے، اصلاً جائز ہے،

لیکن اللہ تعالیٰ رحمتیں نازل فرمائے ہمارے بعد کے فقہاء پر جو اپنے اپنے زمانے کے نبض شناس تھے، اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات پر نگاہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی، انھوں نے بعد میں ایک زبردست انتظامی مصلحت کے تحت "تقلید" کی مذکورہ دونوں قسموں میں سے صرف "تقلیدِ شخصی" کو عمل کے لئے اختیار فرمالیا، اور یہ فتویٰ دیدیا کہ اب لوگوں کو صرف "تقلیدِ شخصی" پر عمل کرنا چاہئے۔

اور کبھی کسی امام اور کبھی کسی امام کی تقلید کے بجائے کسی ایک مجتہد کو معیّن کر کے اسی کے مذہب کی پیروی کرنی چاہیے،

وہ زبردست "انتظامی مصلحت" کیا تھی ؟ اس سوال کے جواب میں پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ "خواہش پرستی" وہ زبردست گمراہی ہے جو بسا اوقات انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر "خواہش پرستی" سے اجتناب کی تلقین فرمائی ہے، اور جگہ جگہ خبردار کیا ہے کہ کہیں یہ روگ تم میں پیدا نہ ہو جائے، قرآنی آیات و احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جو خواہش پرستی کی مذمت اور اس سے دامن بچانے کی تاکید کرتا ہے،

پھر خواہش پرستی بھی ایک تو یہ ہے کہ انسان بُرے کام کو بُرا اور گناہ کو گناہ سمجھتا ہے، مگر اپنے نفس کی خواہشات سے مجبور ہو کر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ صورت ایک بہت بڑا جرم ہونے کے باوجود اتنی سنگین نہیں ہے، کیونکہ اس میں یہ امید رہتی ہے کہ انسان کسی وقت اپنے گناہوں پر نادم ہو اور توبہ کر لے، اس کے برعکس خواہش پرستی کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کی غلامی میں اس حد تک پہنچ جائے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر ڈالے، اور دین و شریعت کو ایک کھلونا بنا دے، ظاہر ہے کہ خواہش پرستی کی یہ دوسری صورت پہلی صورت سے زیادہ سنگین، خطرناک اور تباہ کن ہے، اور جو عمل بھی انسان کو ایسی خواہش پرستی کی راہ پر ڈال سکتا ہو اس سے بچنا ضروری ہے،

فقہاءِ کرام نے محسوس فرمایا کہ لوگوں میں دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے، احتیاط اور تقویٰ اٹھتے جا رہے ہیں، ایسی صورت میں اگر تقلیدِ مطلق کا دروازہ چوپٹ کھلا رہا تو بہت سے لوگ جان بوجھ کر اور بہت سے غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے، مثلاً ایک شخص کے سردی کے موسم میں خون نکل آیا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کا وضو ٹوٹ گیا، اور امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں ٹوٹا، وہ اپنی تن آسانی کی وجہ سے اس وقت امام شافعیؒ کی تقلید کر کے

بلا وضو نماز پڑھ لے گا، پھر اُس کے تھوڑی دیر بعد اگر اس نے کسی عورت کو چھو لیا تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا وضو جاتا رہا، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک برقرار ہے، اس کی تن آسانی اس موقع پر اُسے امام ابو حنیفہؒ کی تقلید کا سبق دے گی، اور پھر وہ بلا وضو نماز کے لئے کھڑا ہو جائے گا، غرض جس امام کے قول میں اُسے آرام اور فائدہ نظر آئے گا اسے اختیار کرے گا، اور جس قول میں کوئی مضرت نظر آئے یا خواہشات کی قربانی دینی پڑے اُسے چھوڑ دے گا، اور ایسا بھی ہوگا کہ اس کا نفس اسی قول کی صحت کی دلیلیں سمجھائے گا، جو اُس کے لئے زیادہ آسان ہو، اور وہ بالکل غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہوگا،

ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتوں کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ احکام شرعیہ نفسانی خواہشات کا ایک کھلونا بن کر رہ جائیں گے، اور یہ وہ چیز ہے جس کے حرام قطعی ہونے میں آجتک کسی مسلمان کا اختلاف نہیں ہوا، علامہ ابن تیمیہؒ اسی چیز کی خرابیوں کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

وقد نص الامام احمد وغیرہ علی انه لیس لاحد ان یعتقد الشیء واجبا او حراما، ثم یعتقدہ غیر واجب او محرم بمجرد هواہ، مثل ان یکون طالبا لشفعة الجوار یعتقدها انها حق له ثم اذا طلبت منه شفعة الجوار اعتقدها انها لیست ثابتة، او مثل من یعتقد اذا کان اخا مع جد ان الاخوة تقاسم الجد فاذا صار جدا مع اخ اعتقد ان الجد لا تقاسم الاخوة، فمثل هذا ممن یکون فی اعتقادہ حل الشیء وحرمته ووجوبه وسقوطه بسبب هواہ هو مذموم مجروح خارج عن العدالة، وقد نص احمد وغیرہ علی ان هذا لا یجوز له

لہ الفتاوی الکبری، لابن تیمیہؒ، ج ۲ ص ۲۴۳، مطبوعہ دار الکتب الحدیثہ مصر" التزام مذہب والمسائل التی یذکر فیها وجہان"

"امام احمدؒ وغیرہ نے تصریح فرمائی ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ محض اپنی خواہشات نفس کے زیر اثر ایک چیز کو پہلے حرام یا واجب سمجھے اور پھر اسی کو جائز یا حرام قرار دیدے، مثلاً جب وہ خود کسی کا پڑوسی ہو اور شفعہ کا دعویٰ کرنا چاہتا ہو تو (امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق) یہ مذہب اختیار کرلے کہ شفعہ کا حق پڑوسی کو ہوتا ہے، پھر جب کوئی دوسرا شخص پڑوس کی وجہ سے اس پر شفعہ کا دعویٰ کرے تو (امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق) یہ قول اختیار کرلے کہ شفعہ کا حق پڑوسی کو نہیں ہے، یا مثلاً ایک شخص کسی مرنے والے کا بھائی ہو اور میت کا دادا بھی موجود ہو تو یہ مذہب اختیار کرلے کہ بھائی میراث میں دادا کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، اور جب خود دادا بنے اور اس کا پوتا اپنے بھائی چھوڑ کر مرجائے تو یہ مذہب اختیار کرلے کہ دادا کی موجودگی میں بھائی وارث نہیں ہوں گے ......

تو اس قسم کے معاملات میں جو شخص محض اپنی خواہشات نفس کی بناء پر کسی چیز کی حلت و حرمت یا وجوب و جواز کا فیصلہ کرتا ہو وہ انتہائی قابل مذمت اور دائرۂ عدالت سے خارج ہے، اور امام احمدؒ وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ یہ عمل ناجائز ہے "

اور ایک دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں :-

یکونون فی وقت یقلدون من یفسدہ و فی وقت یقلدون من یصححہ بحسب الغرض والھویٰ و مثل ھذا لایجوز باتفاق الأئمۃ،

"اس قسم کے لوگ ایک وقت اس امام کی تقلید کرتے ہیں جو نکاح کو فاسد قرار دیتا ہے، اور دوسرے وقت میں اس کی جو اسے درست قرار دیتا ہو اور اس طرح کا عمل باتفاق اُمت ناجائز ہے "

پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں :۔

ونظیر ھذا ان یعتقد الرجل ثبوت شفعة الجوار اذا کان طالباً لھا وعدم ثبوتھا اذا کان مشتریاً، فان ھذا لا یجوز بالاجماع، وکذا من بنی صحة ولایة الفاسق فی حال نکاحه وبنی علی فساد ولایته حال طلاقه لم یجز ذلك باجماع المسلمین، ولو قال المستفتی المعین انا لم اکن اعرف ذلك وانا من الیوم التزم ذلك لم یکن من ذلك، لان ذلك یفتح باب التلاعب بالدین وفتح الذریعة الی ان یکون التحلیل والتحریم بحسب الاھواء[1]

"اسی کی نظیر یہ ہے کہ ایک شخص جب خود طالبِ شفعہ ہو تو پڑوسی کے لئے حقِ شفعہ کا اعتقاد رکھے، اور اگر خود مشتری ہو تو اس کے ثابت نہ ہونے کا معتقد بن جائے، تو یہ باجماع ناجائز ہے، اسی طرح وہ شخص جو بحالتِ قیامِ نکاح فاسق کی ولایت درست ہونے کا قائل ہو (اور اس کی بنا پر نکاح سے فائدہ اٹھاتا رہے) مگر جب تین طلاقیں دیدے تو حرمتِ مغلظہ سے بچنے کے لئے فاسق کی ولایت کو کالعدم اور اس کے ماتحت منعقد شدہ نکاح کو فاسد قرار دے، تو یہ باجماعِ مسلمین ناجائز ہے، اور اگر کوئی مستفتی یہ کہے کہ پہلے مجھے اس مذہب کی خبر نہ تھی، اور اب میں اس کا معتقد اور پابند ہوں، تب بھی اس کا یہ قول قابلِ تسلیم نہیں، کیونکہ یہ دین کو ایک کھلونا بنانے کا دروازہ کھولتا ہے، اور اس بات کا سبب بنتا ہے کہ حرام وحلال کا مدار محض خواہشات پر ہو کر رہ جائے۔"

---

[1] ایضاً فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج ۲ ص ۲۸۵ و ۲۸۶ فیمن تزوّج امرأة بولایة فاسق،

خلاصہ یہ کہ اپنی خواہشاتِ نفس کے تابع ہو کر ایک چیز کو کبھی حلال اور کبھی حرام کر لینا اور جس مذہب میں نفسانی فائدہ نظر آئے اُسے اختیار کر لینا اتنا بڑا جرم ہے کہ وہ کسی کے نزدیک جائز نہیں، اس موضوع پر قرآن و حدیث کی نصوص اور علماء امت کی تصریحات بے شمار ہیں، لیکن یہاں ہم نے صرف علامہ ابن تیمیہؒ کی عبارات پر اس لئے اکتفاء کیا کہ جو حضرات تقلیدِ شخصی کے قائل نہیں ہیں وہ بھی اُن کی جلالتِ قدر کو مانتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ خود علامہ ابن تیمیہؒ بھی تقلیدِ شخصی کے وجوب کے حامی نہیں ہیں، اس کے باوجود یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ اپنی خواہشات کے تابع ہو کر کبھی کسی کا اور کبھی کسی کا مذہب اختیار کر لینا باجماعِ امت ناجائز ہے،

صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے میں چونکہ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کا غلبہ تھا اس لئے اُس دَور میں "تقلیدِ مطلق" سے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ لوگ اپنی خواہشات کے تابع کبھی کسی مجتہد کا اور کبھی کسی مجتہد کا قول اختیار کریں گے، اس لئے اُس دَور میں "تقلیدِ مطلق" پر بے روک ٹوک عمل ہوتا رہا، اور اُس میں کوئی قباحت نہیں سمجھی گئی،

لیکن بعد کے فقہاء نے جب یہ دیکھا کہ دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے اور لوگوں پر نفسانیت غالب آتی جا رہی ہے تو اس وقت انھوں نے مذکورہ بالا انتظامی مصلحت سے یہ فتویٰ دیا کہ اب لوگوں کو صرف تقلیدِ شخصی پر عمل کرنا چاہئے اور "تقلیدِ مطلق" کا طریقہ ترک کر دینا چاہئے، یہ کوئی شرعی حکم نہیں تھا، بلکہ ایک انتظامی فتویٰ تھا، چنانچہ صحیح مسلمؒ کے شارح شیخ الاسلام علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ "تقلیدِ شخصی" کے وجوب کی وجہ بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ووجهه انه لو جاز اتباع اى مذهب شاء لأفضى الى ان يلتقط رخص المذاهب متبعاً هواه ويتخير بين التحليل والتحريم والوجوب والجواز، وذلك يؤدي الى انحلال ربقة التكليف بخلاف العصر الاوّل فانه لم تكن المذاهب الوافية باحكام الحوادث

مذہبہ وعرفت، فعلی ھذا یلزمہ ان یجتہد فی اختیار
مذہب یقلدہ علی التعیین[1]

اُس "تقلیدِ شخصی" کے لازم ہونے) کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس بات کی اجازت ہو کہ انسان جس فقہی مذہب کی چاہے پیروی کر لیا کرے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ ہر مذہب سے آسانیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنی خواہشات نفس کے مطابق اُن پر عمل کیا کریں گے، حلال و حرام اور واجب و جائز کے احکام کا سارا اختیار خود لوگوں کو مل جائے گا، اور بالآخر شرعی احکام کی پابندیاں بالکل کھُل کر رہ جائیں گی، البتہ پہلے زمانہ میں تقلیدِ شخصی اس لئے ممکن نہ تھی کہ فقہی مذاہب مکمل طور سے مدوّن اور معروف و مشہور نہ تھے (لیکن اب جبکہ مذاہب فقہیہ مدوّن اور مشہور ہو چکے) ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ کوشش کر کے کوئی ایک مذہب چُن لے، اور پھر معیّن طور سے اُسی کی تقلید کرے"۔

اس میں علامہ نووی ؒ نے جو فرمایا کہ اگر اس بات کی کھُلی چھٹی دیدی گئی کہ جو شخص جب چاہے جس مجتہد کا چاہے قول اختیار کر لے تو اس کے نتیجہ میں یہ ہو سکتا ہے کہ حلال و حرام ایک ہو جائیں، اور شرعی احکام کی پابندیاں بالکل اُٹھ جائیں، اس کی وضاحت کے لئے عرض ہے کہ عہدِ صحابہؓ سے لے کر اب تک ہزارہا فقہاء مجتہدین پیدا ہوئے ہیں، اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ ہر فقیہ کے مذہب میں کچھ ایسی آسانیاں ملتی ہیں جو دوسروں کے مذہب میں نہیں ہیں، اس کے علاوہ یہ حضرات مجتہدین غلطیوں سے معصوم نہیں تھے، بلکہ ہر ایک مجتہد کے یہاں دو ایک چیزیں ایسی ملتی ہیں جو جمہورِ اُمت کے خلاف ہیں، اب اگر . . . تقلیدِ مطلق کا دروازہ چوپٹ کھول دیا جائے، اور لوگ

---

[1] المجموع شرح المہذب، للنووی ؒ ج ۱ ص ۹۱ مطبوعہ مطبعۃ العاصمۃ، قاہرہ، مقدمہ، فصل فی آداب المستفتی، مسئلہ نمبر ۳،

مجتہدین کے ایسے ایسے مسائل تلاش کرکر کے اُن کی تقلید شروع کردیں، تو اس کا نتیجہ بلاشبہ وہی ہوگا جسے علامہ نوویؒ نے "شرعی احکام کی پابندیوں کے بالکل اُٹھ جانے" سے تعبیر کیا ہے، مثلاً امام شافعیؒ کے مذہب میں شطرنج کھیلنا جائز ہے، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کی طرف منسوب ہے کہ وہ غناء و مزامیر کے جواز کے قائل تھے،[۱] حضرت قاسم بن محمدؒ سے مروی ہے کہ وہ بے سایہ تصویروں کو جائز کہتے تھے،[۲] امام اعمشؒ کی طرف منسوب ہے کہ ان کے نزدیک روزہ کی ابتداء طلوعِ فجر کے بجائے طلوعِ آفتاب سے ہوتی ہے،[۳] حضرت عطاء بن ابی رباحؒ سے منقول ہے کہ اگر عید جمعہ کے دن پڑ جائے تو اس روز جمعہ اور ظہر دونوں ساقط ہوجاتی ہیں، اور عصر تک کوئی نماز فرض نہیں ہوتی،[۴] داؤد ظاہریؒ اور ابن حزمؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی عورت سے نکاح کا ارادہ ہو تو اسے برہنہ دیکھنا بھی جائز ہے،[۵] اور ابن سحنونؒ وغیرہ کی طرف وطی فی الدبر کا جواز منسوب ہے،[۶]

غرض یہ چند مثالیں اس وقت یاد آگئیں، ورنہ اس قسم کے بہت سے اقوال فقہ و حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں، اب اگر تقلیدِ مطلق کی عام اجازت ہو اور ہر شخص کو یہ اختیار دیدیا جائے کہ وہ جس مسئلے میں جس فقیہ کی چاہے تقلید کرلے تو اس قسم کے اقوال کو جمع کرکے ایک ایسا مذہب تیار ہوسکتا ہے جس کا بانی نفس اور شیطان ہوگا، اور دین کو اس طرح خواہشات کا کھلونا بنا لینا کسی کے مذہب میں جائز نہیں ہے، چنانچہ حضرت معمرؒ فرماتے ہیں:

---

[۱] اتحاف السادۃ المتقین، للزبیدیؒ ج ۶ ص ۴۵۸ و ۴۵۹ [۲] نووی شرح مسلمؒ ج ۲ ص ۱۹۹ باب صورۃ الحیوان، [۳] روح المعانی، للآلوسیؒ ج ۲ ص ۶۷ آیت بقرہ: ۱۸۷، علامہ آلوسیؒ نے یہ قول نقل کرکے بڑا دلچسپ جملہ لکھا ہے "خالف فی ذلک الاعمش ولا یتبعہ الا الاعمیٰ" [۴] تہذیب الاسماء واللغات للنوویؒ ج ۱ ص ۳۳۴ [۵] تحفۃ الاحوذی للمبارکپوری ج ۲ ص ۱۷۱، و فتح الملہم ج ۳ ص ۴۷۶ [۶] تلخیص الحبیر للحافظ ابن حجرؒ ج ۳ ص ۱۸۶ اور ۱۸۷،

لوان رجلاً اخذ بقول اهل المدينة فی استماع الغناء واتیان النساء فی ادبارھن، وبقول اھل مکۃ فی المتعۃ والصرف، وبقول اھل الکوفۃ فی المسکر کان شر عباد اللّٰہ[1]

"اگر کوئی شخص غنا سُنے اور وطی فی الدبر کے جواز میں بعض اہل مدینہ کا قول اختیار کرلے، متعہ اور صرف کے بارے میں بعض اہل مکہ کا قول اپنالے اور منشیات کے بارے میں بعض اہل کوفہ کے قول پر عمل کرے تو وہ اللہ کا بدترین بندہ ہوگا"

پھر یہ تو من مانے مذاہب اختیار کرنے کی بدترین مثالیں ہیں لیکن تقلید شخصی کی پابندی سے آزاد ہونے کے بعد معمولی معمولی باتوں میں بھی انسان اس قسم کی خواہش پرستی میں غیر شعوری طور سے مبتلا ہو سکتا ہے،

اسی بنا پر بعد کے فقہاء نے یہ فرمایا کہ اب تقلید شخصی کی پابندی ضروری ہے' اور کسی ایک مجتہد کو معیّن کرکے ہر مسئلے میں اسی کی پیروی کی جائے، تاکہ نفس انسانی کو حلال و حرام کے مسائل میں شرارت کا موقع نہ مل سکے، علامہ عبدالرؤف مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے پر مبسوط بحث کی ہے، چنانچہ فقہاء نے جو تقلید شخصی کو لازم قرار دیا ہے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ علامہ ابن الہمامؒ کا قول نقل کرتے ہیں:

والغالب ان مثل ھذہ الالتزامات لکف الناس عن تتبع الرخص[2]

"غالب یہ ہے کہ یہ پابندیاں اس لئے لگائی گئی ہیں کہ لوگوں کو نفسانی خواہشات کی بنیاد پر، آسانیاں تلاش کرنے سے روکا جاسکے"

---

[1] تلخیص الحبیر للحافظ ابن حجرؒ ج ۳ ص ۱۸۷ (کتاب النکاح نمبر ۱۵۴۲ و عقد الجید ص ۶۲

[2] فیض القدیر شرح الجامع الصغیر للمناویؒ، ج ۱ ص ۲۱۱ حدیث "اختلاف امتی رحمۃ"

علامہ ابو اسحٰق شاطبی مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الموافقات" میں اس موضوع پر مفصّل بحث کی ہے، کہ مختلف مذاہب سے آسانیاں تلاش کر کے اُن پر عمل کرنا کیوں ناجائز ہے؟ اور اس سے کیا کیا مفاسد پیدا ہوتے ہیں! اس ضمن میں انھوں نے ایسے متعدد واقعات بھی نقل کئے ہیں جن میں لوگوں نے وقتی خواہشات کے لئے دوسرے مذاہب پر عمل کیا اور اس طرح قرآن وسنت کی تعمیل کے بجائے اپنی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنے، اسی ضمن میں وہ مالکیہ کے مشہور عالم علامہ مازریؒ کے بارے میں نقل کرتے ہیں، کہ ان سے مالکی مذہب کے ایک غیر مشہور قول پر فتویٰ دینے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے فرمایا:۔

ولست ممن يحمل الناس على غير المعروف المشهور من مذهب مالكؒ واصحابه لان الورع قل، بل كاد يعدم والتحفظ على الديانات كذلك، وكثرت الشهوات وكثر من يدعي العلم ويتجاسر على الفتوى فيه، فلو فتح لهم باب في مخالفة المذهب لاتسع الخرق على الراقع، وهتكوا حجاب هيبة المذهب وهذا من المفسدات التي لا خفاء بها۔[۱]

میں لوگوں کو اس بات پر آمادہ نہیں کرسکتا کہ وہ امام مالکؒ اور اُن کے اصحاب کے غیر مشہور اقوال پر عمل کریں، اس لئے کہ تقویٰ میں کمی آگئی ہے، بلکہ تقریباً نایاب ہو چکا ہے اسی طرح دینداری کے تحفظ کا احساس کم ہو چکا ہے، لوگوں کی خواہشات بڑھ گئی ہیں، علم کے دعویداروں کی کثرت ہو گئی ہے، جو فتویٰ دینے کے معاملے میں نہایت جری ہیں، لہٰذا اگر ان کے لئے مذہب مالکی کی مخالفت کا دروازہ

---

[۱] الموافقات للشاطبی ج ۴ ص کتاب الاجتہاد

کھولا گیا، تو اصلاح کی کوشش سے فساد اور بڑھ جائے گا، مذہب کی ہیبت کا جو پردہ ابھی پڑا ہوا ہے لوگ اُسے چاک کر ڈالیں گے اور یہ ایک ایسا مفسدہ ہے جس میں کوئی پوشیدگی نہیں،،

علامہ شاطبیؒ اُن کا یہ قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

فانظر کیف لم یستجز، وھو المتفق علی امامتہ، الفتوی بغیر مشہور المذھب، ولا بغیر مایعرف منہ، بناء علی قاعدۃ مصلحیۃ ضروریۃ، اذ قل الورع والدیانۃ من کثیر ممن ینتصب لبث العلم والفتوی، کما تقدم تمثیلہ فلو فتح لھم ھذا الباب لانحلت عری المذھب بل جمیع المذاھب[1]،

" ملاحظہ فرمائیے! علامہ مازریؒ کی امامت پر اتفاق ہے، اور انھوں نے کس طرح اس بات کو ناجائز قرار دیا، کہ مذہب مالکی کے غیر مشہور اقوال پر فتویٰ دیا جائے، ان کا یہ ارشاد مصلحت و ضرورت کے قاعدے پر مبنی ہے، کیونکہ تقویٰ اور دیانت بہت سے ان لوگوں میں بھی کم ہو گئی ہے، جو علم اور فتویٰ کی نشر و اشاعت کے کام میں لگے ہوتے ہیں جس کی مثالیں پیچھے گذر چکی ہیں، لہٰذا اگر اُن کے لئے یہ دروازہ کھولا گیا تو مذہبِ مالکی بلکہ تمام مذاہب کی ایک ایک چول ہِل جائیگی،،

اور علامہ ابن خلدونؒ تقلیدِ شخصی کے رواج کے اسباب بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

ووقف التقلید فی الامصار عند ھؤلاء الاربعۃ و درس المقلدون لمن سواھم وسد الناس باب الخلاف وطرقہ لما کثر تشعب الاصطلاحات فی العلوم ولما عاق عن الوصول الی رتبۃ الاجتہاد ولما خشی من

---

[1] الموافقات، للشاطبیؒ ج ۴ ص ۱۴۶ و ۱۴۷ کتاب الاجتہاد، الطرف الاول مسئلہ ۳ فصل ۳

اسناد ذلک الی غیر اھلہ ومن لا یوثق برأیہ ولا بدینہ فصرحوا بالعجز والاعواز وردوا الناس الی تقلید ھؤلاء کل من اختص بہ من المقلدین وحظروا ان یتداول تقلیدھم لما فیہ من التلاعب[1]،

"اور تمام شہروں میں تقلید ان ائمہ اربعہ میں محصور ہوگئی، دوسرے ائمہ کے مقلدین ختم ہوگئے، اور لوگوں نے (ان ائمہ سے) اختلاف کا دروازہ بند کر دیا جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ علوم کی اصطلاحات پیچیدہ ہو کر پھیل گئی تھیں، اور اس کی وجہ اجتہاد کے مرتبے تک پہنچنا سخت مشکل ہوگیا تھا، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ اجتہاد نا اہلوں کے قبضہ میں نہ چلا جائے اور ایسے لوگ اسے استعمال نہ کرنے لگیں جن کی رائے اور دین پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا علماء نے اجتہاد سے عجز کا اعلان کر دیا، اور لوگوں کو ان ائمہ اربعہ کی تقلید شخصی کی طرف لوٹا دیا، اور اس بات کو ممنوع کر دیا کہ ان ائمہ کی بدل بدل کر تقلید کی جائے (یعنی کبھی ایک امام کی اور کبھی دوسرے امام کی) کیونکہ یہ طریقہ دین کے کھلونا بن جانے کا سبب ہو جاتا"

خلاصہ یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ کے دور میں دیانت عام تھی، جس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے اُن کی نفسانیت اس قدر مغلوب تھی کہ خاص طور سے شریعت کے احکام میں انھیں خواہشات کی پیروی کا خطرہ نہیں تھا، اس لئے ان حضرات کے دور میں تقلیدِ مطلق اور تقلیدِ شخصی دونوں پر عمل ہوتا رہا، بعد میں جب یہ زبردست خطرہ سامنے آیا تو تقلید کو تقلیدِ شخصی میں محصور کر دیا گیا، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو احکامِ شریعت کے معاملہ میں... جو افراتفری برپا ہوتی اس کا تصور ہم مشکل ہی سے کر سکتے ہیں، چنانچہ حضرت شاہ

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، ص ۴۴۸ مطبوعہ مکتبہ تجاریہ کبریٰ مصر، کتاب ۱ باب ۶ فصل ۷

ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

واعلم ان الناس کانوا فی المائۃ الاولی والثانیۃ غیر مجتمعین علی التقلید لمذہب واحد بعینہ وبعد المائتین ظہر فیہم التمذہب للمجتہدین باعیانہم وقل من کان لا یعتمد علی مذہب مجتہد بعینہ وکان ھذا ھو الواجب فی ذلک الزمان۔[1]

"یاد رکھئے کہ پہلی اور دوسری صدی میں تمام لوگ کسی ایک معین مذہب کی تقلید (یعنی تقلید شخصی) پر مجتمع نہیں تھے،..... اور دوسری صدی کے بعد اُن میں ایک مجتہد کو معین کرکے اسی کے مذہب پر عمل کرنے کا رواج ہوا، یہاں تک کہ اُس وقت ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو کسی ایک معین مجتہد کے مذہب پر اعتماد نہ کرتے ہوں، اور اس زمانے میں یہی چیز واجب تھی"

اس پر بعض حضرات کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہو کہ ایک چیز صحابہ رضؓ وتابعینؒ کے عہد میں تو ضروری نہ ہو، پھر بعد میں اُسے ضروری قرار دیدیا جائے؟ اس اعتراض کا تسلی بخش جواب دیتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ کتنی اچھی بات تحریر فرماتے ہیں:۔

قلت: الواجب الاصلی ھو ان یکون فی الأمۃ من یعرف الاحکام الفرعیۃ من ادلتھا التفصیلیۃ، اجمع علی ذلک اھل الحق، ومقدمۃ الواجب واجبۃ، فاذا کان للواجب طرق متعددۃ وجب تحصیل طریق من تلک الطرق من غیر تعیین، واذا تعین لہ طریق واحد وجب ذلک الطریق بخصوصہ... وکان السلف لا یکتبون الحدیث ثم صار یومنا ھذا کتابۃ الحدیث واجبۃ، لان روایۃ

---

[1] الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ص ۵۷ و ۵۹ باب ۴ مطبع مجتبائی ۱۹۲۵ء مع ترجمہ اردو۔

الحدیث لاسبیل لها الیوم الامعرفة هذه الکتب وکان السلف لایشتغلون بالنحو واللغة وکان لسانهم عربیًّا لایحتاجون الیٰ هٰذه الفنون، ثم صار یومنا هٰذا معرفة اللغة العربیة واجبة لبعد العهد عن العرب الاوّل، وشواهد ما نحن فیه کثیرة جدًّا، وعلیٰ هٰذا ینبغی ان یقاس وجوب التقلید لامام بعینه فانه قد یکون واجبا وقد لایکون واجبًا،

اس اعتراض کے جواب میں میری گذارش یہ ہے کہ اصل میں تو واجب یہ ہے کہ امت میں ایسے افراد موجود ہوں جو شریعت کے فرعی احکام کو تفصیلی دلائل کے ساتھ جانتے ہوں، (تاکہ لوگ اُن سے مسائل معلوم کرکے عمل کرسکیں) اس بات پر اہلِ حق کا اجماع ہے، لیکن واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے، لہٰذا اگر کسی واجب کی ادائیگی کے متعدد طریقے ہوں، تو ان طریقوں میں سے کسی بھی طریقہ کو اختیار کرلینے سے واجب کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے، لیکن اگر واجب پر عمل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہو تو خاص اسی طریقے کا حاصل کرنا بھی واجب ہو جاتا ہے،..... مثلاً ہمارے اسلاف حدیثوں کو لکھتے نہیں تھے، لیکن ہمارے زمانے میں احادیث کا لکھنا واجب ہوگیا، اس لئے کہ اب روایتِ حدیث کی اس کے سوا کوئی اور سبیل نہیں رہی کہ انہی کتابوں کی مراجعت کی جائے، اسی طرح ہمارے اسلاف صرف، نحو اور لغت کے علوم میں مشغول نہیں ہوتے تھے اس لئے کہ اُن کی مادری زبان عربی تھی، وہ ان فنون کے محتاج نہیں تھے، لیکن ہمارے زمانے میں عربی زبان کا علم حاصل کرنا واجب ہوگیا، اس لئے کہ ہم ابتدائی اہلِ عرب سے بہت دور ہیں، اور اس کے شواہد اور بھی بہت سے ہیں (کہ زمانے کے تغیر سے

ایک چیز پہلے واجب نہ ہو اور بعد میں واجب ہو جائے) اسی پر کسی معین امام کی تقلیدِ شخصی کو قیاس کرنا چاہئے، کہ وہ کبھی واجب ہوتی ہے اور کبھی واجب نہیں ہوتی۔

چنانچہ اسی اصول پر آگے حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

فاذا کان انسان جاھل فی بلاد الھند وماوراء النھر ولیس ھناک عالم شافعیؒ ولا مالکیؒ ولا حنبلیؒ ولا کتاب من کتب ھذہ المذاھب وجب علیہ ان یقلد لمذھب ابی حنیفۃؒ ویحرم علیہ ان یخرج من مذھبہ لانہ حینئذ یخلع من عنقہ ربقۃ الشریعۃ ویبقی سدیً مھملا، بخلاف ما اذا کان فی الحرمین[1]،

"پس اگر کوئی جاہل شخص ہندوستان یا ماوراء النہر کے علاقے میں ہو اور وہاں کوئی شافعی، مالکی، یا حنبلی عالم موجود نہ ہو، اور نہ اُن مذاہب کی کوئی کتاب دستیاب ہو، تو اس پر صرف امام ابو حنیفہؒ ہی کی تقلید واجب ہوگی، اور اُن کے مذہب کو چھوڑنا اس کے لئے حرام ہوگا، کیونکہ اس صورت میں وہ شخص شریعت کی پابندیاں اپنے گلے سے اُتار کر بالکل آزاد اور مہمل ہو جائے گا، برخلاف اس صورت کے جبکہ وہ حرمین میں ہو (کہ وہاں وہ چاروں مذاہب میں سے کسی بھی مذہب کی پابندی کرسکتا ہے)

بعد کے فقہاء نے "تقلیدِ شخصی" کے ذریعہ جس عظیم فتنہ کا انسداد کیا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

وبالجملۃ فالتمذھب للمجتھدین سرّ الھمہ اللّٰہ تعالیٰ العلماء وجمعھم علیہ من حیث یشعرون او لا یشعرون[2]۔

---

[1] الانصاف ص ۶۹ تا ۷۰، حوالہ بالا [2] ایضاً، ص ۶۳،

خلاصہ یہ کہ مجتہدین کے مذہب کی پابندی ایک راز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علماء کے دل میں ڈالا، اور شعوری یا غیر شعوری طور سے ان کو اس پر متفق کر دیا ۔"

ایک اور مقام پر حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

ان هذه المذاهب الاربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الامة، او من يعتد به منها، على جواز تقليدها الى يومنا هذا وفي ذلك من المصالح مالا يخفى، لاسيما في هذه الايام التي قصرت فيها الهمم جدا، واشربت النفوس الهوى، واعجب كل ذي رأي برأيه۔[1]

"بلاشبہ یہ چار مذاہب جو مدوّن ہو کر تحریری شکل میں موجود ہیں، اُن کی تقلید کے جائز ہونے پر تمام امّت کا اجماع ہے، اور اس میں جو مصلحتیں ہیں وہ پوشیدہ نہیں، بالخصوص ... اس زمانے جبکہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں، خواہش پرستی لوگوں کی گھٹی میں پڑ گئی ہے اور ہر ایک صاحبِ رائے اپنی رائے پر گھمنڈ کرنے لگا ہے ۔"

تقلیدِ شخصی کو لازم کرنے کی ایک واضح نظیر

حضرت شاہ صاحبؒ نے جو فرمایا کہ قرونِ اولیٰ میں کسی ایک معیّن مجتہد کی تقلید پر لوگ مجتمع نہ تھے، بعد میں تقلیدِ شخصی پر اتفاق ہو گیا، اور پھر وہی واجب ہو گئی، اس کی ایک واضح نظیر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمعِ قرآن کا واقعہ ہے، حافظ ابن جریرؒ وغیرہ کے مشہور نظریے کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے سات حروف میں سے چھ حروف کو ختم فرما کر صرف حرفِ قریش کو باقی رکھا تھا، اور جتنے مصاحف حرفِ قریش کے خلاف تھے انکو نذرِ آتش کرا دیا تھا، یعنی عہدِ رسالتؐ اور شیخینؓ کے عہدِ خلافت تک ہر شخص کے لئے

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص ۱۵۳ باب حکایۃ اہل الناس قبل المائۃ الرابعۃ و بعدھا

جائز تھا کہ وہ قرآن کریم کے سات حروف میں سے کسی بھی حرف پر تلاوت کرے، لیکن جب حضرت عثمانؓ نے دیکھا کہ اگر اس اجازت کو برقرار رکھا گیا تو زمانے کے تغیر سے فتنے کا اندیشہ ہے، تو انھوں نے چھ حروف کو ختم فرماکر صرف حرفِ قریش پر قرآن کی تلاوت کو لازم کر دیا، حافظ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

فکذلک الامۃ امرت بحفظ القرآن وقراءتہ، وخیّر فی قراءتہ بایّ الاحرف السبعۃ شاءت قرأت، لعلّۃ من العلل اوجبت علیہا الثبات علی حرف واحد ... قراءتہ بحرف واحد، ورفض القراءۃ بالاحرف الستۃ الباقیۃ،[1]

"اسی طرح اُمّت کو دراصل اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ قرآن کریم کی حفاظت کرے اور اس کی تلاوت کرے، البتہ قرارت میں اسے یہ اختیار دیدیا گیا تھا کہ وہ حروفِ سبعہ میں سے جس قرارت کے مطابق پڑھنا چاہے پڑھ سکتی ہے، اب اسی امّت نے بعض خاص اسباب کے ماتحت اپنے اوپر یہ واجب کرلیا کہ ہم صرف ایک حرف پر قائم رہیں گے، اور ایک ہی حرف پر قرآن کو پڑھیں گے، اور باقی چھ حروف کے مطابق قرارت کو ترک کر دیا گیا۔"

اس پر جو اعتراض ہوسکتا ہے کہ جس چیز کو عہدِ رسالتؐ میں جائز قرار دیا گیا تھا اسے بعد میں ناجائز کیوں قرار دیدیا گیا؟ اس کے جواب میں حافظ ابن جریرؒ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اُمّت کو سات حروف کا محض اختیار دیا گیا تھا، ان ساتوں حروف کے مطابق پڑھنا کوئی فرض یا واجب نہیں تھا، بعد میں اُمّت نے دین کی مصلحت اس میں

---

[1] تفسیر ابن جریرؒ ج ۱ ص ۱۹،

دیکھی کہ چھ حروف کو ختم کر کے صرف ایک حرف باقی رکھا جائے، لہٰذا اس نے چھ حروف ختم کر دیئے اور:۔

> كان الواجب عليهم من الفعل ما فعلوا، اذ كان الذى فعلوا من ذلك كان هو النظر للاسلام واهله، فكان القيام بفعل الواجب عليهم بهم اولى من فعل مالو فعلوه كانوا الى الجناية الى الاسلام واهله اقرب منهم الى السلامة من ذلك۔[1]
>
> "ان حضرات پر واجب وہی کام تھا جو انھوں نے کیا، اس لئے کہ جو کچھ انھوں نے کیا وہ اسلام اور اہلِ اسلام کی مصلحت بینی کے لئے کیا، لہٰذا اپنے اس فریضہ کی ادائیگی اُن کے لئے زیادہ بہتر تھی، بہ نسبت اس (ساتوں حروف کو باقی رکھنے کے) فعل کے جس کے ذریعے اسلام اور اہلِ اسلام کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچنے کا زیادہ احتمال تھا۔"

مذکورہ بالا گفتگو تو حافظ ابن جریرؒ کے نظریئے کے مطابق کی گئی ہے، حضرت عثمانؓ کے جمعِ قرآن کے بارے میں ایک دوسرا نظریہ بھی ہے جسے امام مالکؒ، علامہ ابن قتیبہؒ، امام ابوالفضل رازیؒ اور علامہ ابن الجزریؒ وغیرہ نے اختیار کیا ہے، اور وہ نظریہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف ختم نہیں فرمائے تھے، بلکہ ساتوں حروف آج بھی متواتر قراءتوں کی شکل میں محفوظ ہیں، البتہ انھوں نے قرآن کریم کا ایک رسم الخط متعین کر دیا تھا۔[2]

اگر اس نظریئے کو اختیار کیا جائے (اور بیشتر محققین کا رجحان اسی طرف ہے)

---

[1] تفسیر ابن جریر، ج ۱ ص ۲۲، مقدمہ [2] اس نظریئے کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر غرائب القرآن للنیشاپوریؒ بہامش ابن جریرؒ ج ۱ ص ۲۱ و فتح الباری ج ۹ ص ۲۵ و ۲۶ طبع بہیہ۔

تب بھی یہ واقعہ تقلیدِ شخصی کے معاملے کی نظیر ہے، اس لئے کہ حضرت عثمان رضؓ سے پہلے قرآن کریم کو کسی بھی رسم الخط کے مطابق لکھا جا سکتا تھا، بلکہ مختلف مصاحف میں سورتوں کی ترتیب بھی مختلف تھی، اور ان مختلف ترتیبوں کے مطابق قرآن کریم کو لکھنا جائز تھا، لیکن حضرت عثمانؓ نے اُمّت کی اجتماعی مصلحت کے پیشِ نظر اس اجازت کو ختم فرما کر قرآن کریم کے ایک رسم الخط اور ایک ترتیب کو معیّن کر دیا، اور اسی کی اتباع کو لازم کر کے باقی مصاحف کو نذرِ آتش کرا دیا،[۱]

بہر کیف! حضرت عثمانؓ نے اُمّت کو ایک حرف پر جمع کیا ہو یا ایک رسم الخط اور ایک ترتیب پر، یہ واقعہ دونوں صورتوں میں تقلید کے معاملے کی نظیر ہے، اور بعینہٖ یہی صورتِ حال تقلید کے معاملے میں بھی پیش آئی ہے، کیونکہ صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے میں کسی ایک امام کی تقلیدِ شخصی واجب نہ تھی، لیکن پیچھے جو مصلحتیں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں اُن کے پیشِ نظر علماءِ امّت نے صرف تقلیدِ شخصی کو عمل کے لئے اختیار کر لیا، اور تقلیدِ مطلق کو چھوڑ دیا، لہٰذا اس عمل کو بدعت نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ حضرت عثمانؓ کا واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر امّت کو کسی مقصد کے حصول کے لئے متعدد امور کا اختیار ملا ہو تو وہ زمانے کے فساد کے پیشِ نظر ان میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کر کے باقی طریقوں کو چھوڑ سکتی ہے، اور تقلیدِ شخصی کے معاملے میں اس سے زائد کچھ نہیں ہوا،

مذاہبِ اربعہ کی تخصیص؛

جب "تقلیدِ شخصی" کی حقیقت اور ضرورت واضح ہو گئی تو اب ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ اگر کسی بھی ایک امام کو معیّن کر کے اس کی تقلید کرنا ٹھہرا تو پھر صرف ان چار اماموں کی کیا خصوصیت ہے؟ اُمّت میں دوسرے بہت سے

---

[۱] اس مسئلے کی پوری تحقیق احقر کی کتاب "علوم القرآن" میں ملے گی،

مجتہدین گذرے ہیں، مثلاً سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ، عبداللہ بن المبارکؒ، اسحاق بن راھویہؒ، امام بخاریؒ، ابن ابی لیلیٰؒ، ابن شبرمہؒ اور حسن بن صالحؒ وغیرہ بیسیوں ائمہ مجتہدین موجود ہیں، ان میں سے کسی کی تقلید کیوں نہیں کی جاتی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان حضرات کی تقلید نہ کرنے کی وجہ ایک مجبوری ہے، اور وہ مجبوری یہ ہے کہ ان حضرات کے فقہی مذاہب مدوّن شکل میں محفوظ نہیں رہ سکے، اگر ان حضرات کے مذاہب بھی اسی طرح مدوّن ہوتے جس طرح ائمہ اربعہ کے مذاہب مدوّن ہیں، تو بلاشبہ ان میں سے کسی کو بھی تقلید کے لئے اختیار کیا جا سکتا تھا لیکن نہ تو ان حضرات کے مذاہب کی مفصّل کتابیں مدوّن ہیں، نہ ان مذاہب کے علماء پائے جاتے ہیں، اس لئے اب ان کی تقلید کی کوئی سبیل نہیں ہے، مشہور محدّث علامہ عبدالرؤف مناویؒ حافظ ذہبیؒ سے نقل کرتے ہیں :-

ویجب علینا ان نعتقد ان الائمة الاربعة والسفیانین والاوزاعی وداؤد الظاهری واسحاق بن راهویه وسائر الائمة علی هدی .... وعلی غیر المجتهد ان یقلد مذهبا معینا .... لکن لا یجوز تقلید الصحابة وکذا التابعین کما قاله امام الحرمین من کل من لم یدون مذهبه فیمتنع تقلید غیر الاربعة فی القضاء والافتاء لان المذاهب الاربعة انتشرت وتحررت حتی ظهر تقیید مطلقها وتخصیص عامها بخلاف غیرهم لانقراض اتباعهم، وقد نقل الامام الرازی رحمه الله تعالی اجماع المحققین علی منع العوام من تقلید اعیان الصحابة واکابرهم۔[1]

---

[1] فیض القدیر، شرح الجامع الصغیر للمناویؒ، ج ۱ ص ۲۱۰ حدیث "اختلاف امتی رحمة"۔

ہم پر یہ اعتقاد رکھنا واجب ہے کہ ائمۂ اربعہ دونوں سفیان (یعنی سفیان ثوریؒ اور سفیان بن عیینہؒ) امام اوزاعیؒ داؤد ظاہریؒ، اسحٰق بن راہویہؒ اور تمام ائمہ ہدایت پر ہیں، . . . اور جو شخص خود مجتہد نہ ہو اس پر واجب ہے کہ کسی معین مذہب کی تقلید کرے۔ ... لیکن صحابہؓ و تابعین اور ان تمام حضرات کی تقلید بقول امام الحرمین جائز نہیں ہے جن کے مذاہب مدوّن نہیں ہوئے، لہٰذا قضاء اور فتویٰ میں ائمۂ اربعہ کے علاوہ کسی اور کی تقلید ناجائز ہے، اس لئے کہ مذاہب اربعہ مدوّن ہو کر پھیل چکے ہیں، اور اُن کے مطلق الفاظ کی قیود اور عام الفاظ کی تخصیصات واضح ہو چکی ہیں، بخلاف دوسرے مذاہب کے کہ ان کے متبعین ختم ہو چکے، اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پر محققین کا اجماع نقل کیا ہے کہ عوام کو مشاہیر صحابہؓ اور دوسرے اکابر کی تقلید سے روکنا چاہئے۔"

اسی بات کو علّامہ نوویؒ رحمۃ اللہ علیہ ان الفاظ میں واضح فرماتے ہیں:۔

ولیس لہ التمذھب بمذھب احد من ائمۃ الصحابۃ رضی اللہ عنھم وغیرھم من الاوّلین وان کانوا اعلم واعلیٰ درجۃ ممن بعدھم، لانھم لم یتفرغوا لتدوین العلم وضبط اصولہ وفروعہ، فلیس لاحد منھم مذھب مھذب محرر مقرر، وانما قام بذلک من جاء بعدھم من الائمۃ الناحلین لمذاھب الصحابۃ والتابعین القائمین بتمھید احکام الوقائع قبل وقوعھا الناھضین بایضاح اصولھا وفروعھا کمالکؒ وابی حنیفۃ۔"[1]

---

[1] المجموع، شرح المہذب، للنوویؒ ج ۱ ص ۹۱ فصل فی آداب المستفتی۔

صحابۂ کرامؓ اور قرونِ اولیٰ کے اکابر اگرچہ درجہ کے اعتبار سے بعد کے فقہاء مجتہدین سے بلند و برتر ہیں، لیکن انھیں اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ اپنے علم اور اس کے اصول و فروع کو مدوّن اور منضبط کر سکتے، اس لئے کسی شخص کے لئے اُن کے فقہی مذہب کی تقلید جائز نہیں، کیونکہ ان میں سے کسی کا مذہب مدوّن نہیں ہو سکا، نہ وہ لکھی ہوئی شکل میں موجود ہے، اور نہ معیّن طور سے اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے، دراصل تدوینِ فقہ کا یہ کام بعد کے ائمہ نے کیا ہے، جو خود صحابہؓ و تابعینؒ کے مذاہب کے خوشہ چین تھے، اور جنھوں نے واقعات کے پیش آنے سے پہلے ہی اُن کے احکام مدوّن کئے اور اپنے مذاہب کے اصول و فروع کو واضح کیا، مثلاً امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ،

اس موضوع پر بہت سے علماء کی تصریحات پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن اختصار کے پیشِ نظر ہم صرف دو اور بزرگوں کا کلام اس موضوع پر پیش کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں بزرگ اُن حضرات کی نظر میں بھی علم و دیانت کے اعتبار سے بلند مقام رکھتے ہیں جو تقلید کے قائل نہیں ہیں، ان میں سے ایک علامہ ابن تیمیہؒ ہیں اور دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلویؒ،

علامہ ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں :-

ولیس فی الکتاب والسنۃ فرق فی الائمۃ المجتہدین بین شخص وشخص، فمالک واللیث بن سعد والاوزاعی والثوری ھؤلاء ائمۃ فی زمانھم، وتقلید کل منھم کتقلید الآخر لایقول مسلم انہ یجوز تقلید ھذا دون ھذا ولکن من منع من تقلید احد ھؤلاء فی زماننا، فانما یمنعہ لاحد شیئین (احدھما) اعتقادہ انہ لم یبق من یعرف مذاھبھم وتقلید المیت فیہ نزاع

مشہور، فمن منعہ قال ھؤلاء موتی، ومن سوّغہ قال لابد ان یکون فی الاحیاء من یعرف قول المیّت (والثانی) ان یقول الاجماع الیوم قد انعقد علی خلاف ھذا القول...... واما اذا کان القول الذی یقول بہ ھؤلاء الائمۃ اوغیرھم قد قال بہ بعض العلماء الباقیۃ مذاھبھم فلاریب ان قولہ مؤید بموافقۃ ھؤلاء ویعتضد بہ[1]،

کتاب وسنت کے اعتبار سے ائمہ مجتہدین کے درمیان کوئی فرق نہیں، پس امام مالکؒ، لیث بن سعدؒ، امام اوزاعیؒ اور سفیانؒ ثوریؒ یہ سب حضرات اپنے اپنے زمانوں کے امام ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی تقلید کا حکم وہی ہے جو دوسرے کی تقلید کا ہے، کوئی مسلمان یہ نہیں کہتا کہ اس کی تقلید تو جائز ہے اور اس کی جائز نہیں لیکن جن حضرات نے ان میں سے کسی کی تقلید سے منع کیا ہے، دو باتوں میں سے کسی بات کی بنا پر منع کیا ہے :-

ایک بات تو یہ ہے کہ اُن کے خیال میں اب ایسے لوگ باقی نہیں رہے جو ان حضرات کے مذاہب سے پوری طرح واقف ہوں، اور فوت شدہ امام کی تقلید میں اختلاف مشہور ہی ہے، لہٰذا جو لوگ اُسے منع کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ان حضرات کا انتقال ہو چکا، اور جو حضرات فوت شدہ امام کی تقلید کو جائز مانتے ہیں، اُن کا کہنا یہ ہے کہ فوت شدہ امام کی تقلید اُس وقت جائز ہے جبکہ زندہ علماء میں کوئی اُس فوت شدہ امام کے مذہب کا علم رکھتا ہو

---

[1] الفتاوی الکبریٰ لابن تیمیہؒ ج ۲، ص ۲۶۴ فمن صلّی خلف الصف منفرداً،

(اور چونکہ دوسرے ائمہ کے مذاہب کا علم رکھنے والا موجود نہیں،
اس لئے اُن کی تقلید بھی درست نہیں)
دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ (جن حضرات
کے مذاہب باقی نہیں اُن کے) قول کے خلاف اجماع منعقد ہو چکا
ہے ..... لیکن ان گزشتہ ائمہ کا کوئی قول اگر ایسا ہو جو اُن مجتہدین
کے قول کے مطابق ہو جن کے مذاہب باقی ہیں تو بلا شبہ اوّل الذکر
ائمہ کے قول کی ثانی الذکر علماء کے قول سے تائید ہو جائے گی، اور اس
میں قوت آجائے گی،

دوسرے بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں،
انھوں نے اپنی کتاب "عقد الجید" میں اس موضوع کے لئے ایک مستقل باب رکھا ہے
جس کا عنوان ہے "باب تاکید الاخذ بهذه المذاهب الاربعة والتشديد في تركها والخروج عنها" (یعنی باب سوم ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید اور ان کو
چھوڑنے اور اُن سے باہر نکلنے کی ممانعت شدید میں) اس باب کا آغاز وہ ان الفاظ سے
کرتے ہیں:-

اعلم ان فی الاخذ بهذه المذاهب الاربعة مصلحة
عظيمة وفي الاعراض عنها كلها مفسدة كبيرة ونحن
نبين ذلك بوجوه[1] الخ،

"یاد رکھئے کہ ان چار مذاہب کو اختیار کرنے میں بڑی عظیم مصلحت
ہے، اور ان سب کے سب سے اعراض کرنے میں بڑے مفاسد ہیں
ہم اس بات کو کئی وجوہ سے واضح کرتے ہیں۔" الخ

---

[1] عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، ص ۳۱، مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۳۴۴ھ مع
اردو ترجمہ از مولانا محمد احسن نانوتویؒ،

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے تفصیل کے ساتھ اس کی وجوہ بیان فرمائی ہیں، یہاں ان کی اصل عربی عبارتوں کا نقل کرنا تو موجب تطویل ہوگا، ہم ان وجوہ کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہیں :-

(۱) شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ شریعت کو سمجھنے کے لئے اسلاف پر اعتماد باجماعِ امّت ناگزیر ہے، لیکن سلف کے اقوال پر اعتماد اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے جب وہ اقوال یا تو صحیح سند کے ساتھ ہم تک پہنچے ہوں یا مشہور کتابوں میں مدوّن ہوں، نیز ان اقوال پر اعتماد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اقوال مخدوم ہوں یعنی بعد کے علماء نے ان اقوال کی شروح و توضیح کی خدمت کی ہو، اگر ان اقوال میں کئی معنیٰ کا احتمال ہو تو اُن پر بحث کرکے راجح احتمال کو معیّن کیا گیا ہو، نیز بعض مرتبہ کسی مجتہد کا قول بظاہر عام ہوتا ہے، لیکن اس سے کوئی خاص صورت مراد ہوتی ہے (جسے اُس کے مذہب کے مزاج شناس علماء سمجھتے ہیں) اس لئے یہ بھی ضروری ہو کہ اس مذہب کے اہل علم نے ایسی صورتوں کو واضح کر رکھا ہو اور اس کے احکام کی علّتیں بھی واضح کردی ہوں، اور جب تک کسی مجتہد کے مذہب کے بارے میں یہ کام نہ ہوا ہو اُس وقت تک اُس پر اعتماد کرنا درست نہیں، اور یہ صفات ہمارے زمانے میں مذاہبِ اربعہ کے سوا کسی مذہب میں نہیں پائی جاتیں، صرف امامیّہ اور زیدیّہ اس سے مستثنیٰ ہیں، لیکن چونکہ وہ اہل بدعت (روافض) ہیں، اس لئے ان کے اقوال پر اعتماد درست نہیں،

(۲) مذاہب اربعہ کی پابندی کی دوسری وجہ حضرت شاہ صاحبؒ یہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ

یعنی سوادِ اعظم کی پیروی کرو

اور جب ان چار مذاہب کے سوا دوسرے برحق مذاہب نابود ہوگئے تو اب انہی چار مذاہب کا اتباع سوادِ اعظم کا اتباع ہے۔ اور ان سے باہر جانا سوادِ اعظم کی مخالفت

(۳) تیسری وجہ حضرت شاہ صاحبؒ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اگر مذاہبِ اربعہ سے باہر کسی بھی مجتہد کے قول پر فتویٰ دینے کی اجازت دیدی جائے تو خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنے والے علماءِ سُوء، اپنے کسی بھی فتویٰ کو سلف کے کسی مشہور عالم کی طرف منسوب کر دیں گے، اور کہیں گے کہ یہ بات فلاں امام کے فلاں قول سے ثابت ہے، لہٰذا جس امام کے اقوال کی تشریح و توضیح میں علماءِ حق کی بڑی تعداد مشغول رہی ہو، اُن کے مذہب پر عمل کرنے میں تو یہ خطرہ نہیں، لیکن جہاں یہ بات نہ ہو (بلکہ کسی مجتہد کے اِکّا دُکّا اقوال ملتے ہوں) وہاں اس بات کا شدید خطرہ ہے (کہ اس مجتہد کی بات کو غلط معنی پہنا کر اس سے من مانے نتائج نکال لئے جائیں گے)[۱]

تقلید کے مختلف درجات

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات تو بحمد اللہ واضح ہوگئی کہ آجکل صرف چار آئمہ مجتہدین میں سے کسی ایک کی تقلیدِ شخصی پر کیوں زور دیا جاتا ہے؟

اب ہمیں تقلید کے بارے میں ایک اور ضروری بات عرض کرنی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تقلید کرنے والے کے لحاظ سے تقلید کے مختلف درجات ہوتے ہیں اور ان درجات کے احکام جُدا جُدا ہیں، ان مختلف درجات میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، غیر مقلد حضرات تقلید پر جو اعتراضات وارد کرتے ہیں احقر کی نظر میں اُن میں سے بیشتر اعتراضات اسی فرقِ مراتب کو نہ سمجھنے یا اس سے صرفِ نظر کر لینے کا نتیجہ ہیں، اس لئے اُن درجات کو ہم قدرے تفصیل کے ساتھ ذیل میں بیان کرتے ہیں، واللہ الموفق للحق والصواب،

۱۔ عوام کی تقلید

تقلید کا سب سے پہلا درجہ "عوام کی تقلید" کا ہے؛ یہاں "عوام" سے ہماری مراد مندرجۂ ذیل اقسام کے حضرات ہیں:

(۱) وہ حضرات جو عربی زبان اور اسلامی علوم سے بالکل ناواقف ہوں، خواہ وہ دوسرے

---

[۱] ملاحظہ ہو عقد الجید، ص ۳۱ تا ۳۳ حوالۂ بالا،

فنون میں وہ کتنے ہی تعلیم یافتہ اور ماہر و محقق ہوں،

(۲) وہ حضرات جو عربی زبان جانتے اور عربی کتابیں سمجھ سکتے ہوں لیکن انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ اور متعلقہ دینی علوم کو باقاعدہ اساتذہ سے نہ پڑھا ہو،

(۳) وہ حضرات جو رسمی طور پہ اسلامی علوم سے فارغ التحصیل ہوں، لیکن تفسیر، حدیث، فقہ، اور ان کے اصولوں میں اچھی استعداد اور بصیرت پیدا نہ ہوئی ہو،

یہ تینوں قسم کے حضرات تقلید کے معاملے میں "عوام" ہی کی صف میں شمار ہوں گے، اور تینوں کا حکم ایک ہی،

اس قسم کے عوام کو "تقلید محض" کے سوا چارہ نہیں، کیونکہ ان میں اتنی استعداد اور صلاحیت نہیں ہے کہ وہ براہ راست کتاب وسنت کو سمجھ سکیں، یا اس کے متعارض دلائل میں تطبیق و ترجیح کا فیصلہ کر سکیں، لہذا احکام شریعت پر عمل کرنے کے لئے ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ کسی مجتہد کا دامن پکڑیں اور اس سے مسائل شریعت معلوم کریں، چنانچہ علامہ خطیب بغدادیؒ تحریر فرماتے ہیں :-

أما من يسوغ له التقليد فهو العامي الذي لا يعرف طرق الاحكام الشرعية فيجوز له ان يقلد عالما و يعمل بقوله ..... ولانه ليس من اهل الاجتهاد فكان فرضه التقليد كتقليد الاعمى في القبلة فانه لما لم يكن معه آلة الاجتهاد في القبلة كان عليه تقليد البصير فيها[1]،

رہی یہ بات کہ تقلید کس کے لئے جائز ہے ؟ سو وہ عامی شخص ہے جو احکام شرعیہ کے طریقوں سے واقف نہیں، لہذا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی عالم کی تقلید کرے اور اس کے قول پر عمل پیرا ہو.....

---

[1] الفقیہ والمتفقہ، لخطیب بغدادیؒ، ص ۶۸، مطبوعہ دار الافتاء سعودیہ، ریاض ۱۳۸۹ھ

(آگے قرآن وسنت سے اس کی دلیلیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں)
نیز اس لئے کہ وہ (عام آدمی) اجتہاد کا اہل نہیں ہے، لہٰذا اس کا فرض
یہ ہے کہ وہ بالکل اس طرح تقلید کرے جیسے ایک نابینا قبلے کے معاملے
میں کسی آنکھ والے کی تقلید کرتا ہے، اس لئے کہ جب اس کے پاس
کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ اپنی ذاتی کوشش کے ذریعے
قبلے کا رُخ معلوم کر سکے تو اس پر واجب ہے کہ کسی آنکھ والے کی
تقلید کرے"

اس درجے کے مقلد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ دلائل کی بحث میں اُلجھے، اور یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ کونسے فقیہ ومجتہد کی دلیل زیادہ راجح ہے؟ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ کسی مجتہد کو متعین کرکے ہر معاملے میں اسی کے قول پر اعتماد کرتا رہے، کیونکہ اس کے اندر اتنی استعداد موجود نہیں ہے کہ وہ دلائل کے راجح و مرجوح ہونے کا فیصلہ کر سکے، بلکہ ایسے شخص کو اگر اتفاقاً کوئی حدیث ایسی نظر آجائے جو بظاہر اس کے امام مجتہد کے مسلک کے خلاف معلوم ہوتی ہو تب بھی اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے امام ومجتہد کے مسلک پر عمل کرے، اور حدیث کے بارے میں یہ اعتقاد رکھے کہ اس کا صحیح مطلب میں نہیں سمجھ سکا، یا یہ کہ امام مجتہد کے پاس اُس کے معارض کوئی قوی دلیل ہوگی،

بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مجتہد کے مسلک کو قبول کر لیا جائے اور حدیث میں تاویل کا راستہ اختیار کیا جائے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس درجے کے مقلد کا بیان ہو رہا ہے اُس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، اور اگر ایسے مقلد کو یہ اختیار دیدیا جائے کہ وہ کوئی حدیث اپنے امام کے مسلک کے خلاف پاکر امام کے مسلک کو چھوڑ سکتا ہے، تو اس کا نتیجہ شدید افراتفری اور سنگین گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا، اس لئے کہ قرآن وحدیث سے مسائل کا استنباط ایک ایسا وسیع وعمیق فن ہے کہ اس میں عمریں کھپاکر بھی ہر شخص اس پر عبور حاصل نہیں کر سکتا، بسا اوقات

ایک حدیث کے ظاہری الفاظ سے ایک مفہوم نکلتا ہے، لیکن قرآن وسنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں اس کا بالکل دوسرا مفہوم ثابت ہوتا ہے، اب اگر ایک عام آدمی صرف ایک حدیث کے ظاہری مفہوم کو دیکھکر اس پر عمل کرلے تو اس سے طرح طرح کی گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں، خود راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے کہ قرآن و سنت کے علوم میں گہری استعداد کے بغیر جن لوگوں نے براہِ راست احادیث کا مطالعہ کرکے اُن پر عمل کی کوشش کی ہے وہ غلط فہمیوں کا شکار ہوتے ہوتے پرلے درجے کی گمراہیوں میں مبتلا ہوگئے ہیں،

راقم الحروف کے ایک گریجویٹ دوست مطالعہ کے شوقین تھے، اور انھیں بطور خاص احادیث کے مطالعہ کا شوق تھا، اور ساتھ ہی یہ بات بھی اُن کے دماغ میں سمائی ہوئی تھی کہ اگرچہ میں حنفی ہوں، لیکن اگر حنفی مسلک کی کوئی بات مجھے حدیث کے خلاف معلوم ہوئی تو میں اُسے ترک کردوں گا، چنانچہ ایک روز انھوں نے احقر کی موجودگی میں ایک صاحب کو یہ مسئلہ بتایا کہ "ریح خارج ہونے سے اُس وقت تک وضو نہیں ٹوٹتا جب تک کہ ریح کی بدبو محسوس نہ ہو، یا آواز نہ سُنائی دے" میں سمجھ گیا کہ وہ بیچارے اس غلط فہمی میں کہاں سے مبتلا ہوئے ہیں؟ میں نے ہرچند انھیں سمجھانے کی کوشش کی، لیکن شروع میں انھیں اس بات پر اصرار رہا کہ یہ بات میں نے ترمذی کی ایک حدیث میں دیکھی ہے، اس لئے میں تمھارے کہنے کی بناء پر حدیث کو نہیں چھوڑ سکتا، آخر جب میں نے تفصیل کے ساتھ حدیث کا مطلب سمجھایا اور حقیقت واضح کی تب انھوں نے بتایا کہ میں تو عرصۂ دراز سے اس پر عمل کرتا آرہا ہوں، اور نہ جانے کتنی نمازیں میں نے اس طرح پڑھی ہیں کہ آواز اور بُو نہ ہونے کی وجہ سے میں یہ سمجھتا رہا کہ میرا وضو نہیں ٹوٹا،

دراصل وہ اس سنگین غلط فہمی میں اس لئے مبتلا ہوئے کہ انھوں نے جامع ترمذی میں یہ حدیث دیکھی کہ:-

عن ابی ھریرۃؓ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال

لا وضوء الا من صوت او ریح،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وضو اسی وقت واجب ہے جب کہ یا آواز ہو یا بدبو ہو۔"

اسی کے ساتھ جامع ترمذی میں یہ حدیث بھی انھیں نظر پڑی کہ:۔

اذا کان احدکم فی المسجد فوجد ریحا بین الیتیہ فلا یخرج حتی یسمع صوتا او یجد ریحا،[۱]

اگر تم میں سے کوئی شخص مسجد میں ہو اور اسے اپنے سرینوں کے درمیان ہوا محسوس ہو تو وہ اس وقت تک مسجد سے (بہ ارادۂ وضو) نہ نکلے جب تک اُس نے (خروج ریح کی) آواز نہ سنی ہو یا اس کی بدبو محسوس نہ کی ہو؛

اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے انھوں نے یہی سمجھا کہ وضو ٹوٹنے کا مدار آواز یا بُو پر ہے، حالانکہ تمام فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اُن وہمی قسم کے لوگوں کے لئے ہے جنھیں خواہ مخواہ وضو ٹوٹنے کا شک ہو جاتا ہے، اور مقصد یہ ہے کہ جب تک خروجِ ریح کا ایسا یقین حاصل نہ ہو جائے جیسا آواز سننے یا بو محسوس کرنے سے حاصل ہوتا ہے، اُس وقت تک وضو نہیں ٹوٹتا، چنانچہ دوسری روایات میں حدیث کا یہ مطلب صاف ہو گیا ہے، مثلاً ابو داؤد میں حضرت ابوہریرہؓ ہی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

اذا کان احدکم فی الصلوٰۃ فوجد حرکۃ فی دبرہ احدث اولم یحدث فاشکل علیہ فلا ینصرف حتی یسمع صوتا او یجد ریحا[۲]

"اگر تم میں سے کوئی شخص نماز میں ہو، اور اسے اپنی پشت میں

---

[۱] جامع ترمذی، ج ۱ ص ۲۱ باب ما جاء فی الوضوء من الریح، [۲] سنن ابی داؤد، ج ۱ ص ۲۴ باب من شک فی الحدث،

حرکت محسوس ہو جس سے اُس کو یہ شبہ ہونے لگے کہ ریح خارج ہوئی
ہے یا نہیں تو اس کو چاہیئے کہ اس وقت تک وہ وہاں سے نہ ہٹے
جب تک آواز نہ سُن لے یا بُو نہ پالے "

نیز ابو داؤد ہی میں حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے واضح فرمایا ہے کہ یہ جواب آپؐ نے ایک ایسے شخص کو دیا تھا جو اس معاملے میں اوہام و وساوس کا مریض تھا،

لیکن حدیث کے مختلف طرق اور الفاظ کو جمع کرکے اُن سے کسی نتیجہ تک وہی شخص پہونچ سکتا ہے جو علم حدیث کا ماہر ہو، محض ایک کتاب میں کوئی حدیث یا اس کا ترجمہ دیکھ کر تو انسان اسی گمراہی اور غلط فہمی میں مبتلا ہوگا جس میں وہ صاحب مبتلا ہوئے تھے،

اسی طرح اگر ہر شخص کو یہ اختیار دیدیا جائے کہ وہ کسی حدیث کو اپنے امام کے مسلک کے خلاف دیکھ کر امام کا مسلک چھوڑ سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ جامع ترمذیؒ میں اُس کو یہ حدیث نظر پڑے کہ :-

عن ابن عباسؓ قال جمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بین الظھر والعصر، وبین المغرب والعشاء بالمدینۃ
من غیر خوف ولا مطر، قال، فقیل لابن عباسؓ ما
اراد بذلك ؟ قال: اراد ان لا تحرج امتہ[1]

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے مدینہ طیبہ میں کسی خوف یا بارش کی حالت کے بغیر ظہر اور عصر کو
نیز مغرب اور عشاء کو اکٹھا کرکے ایک وقت میں پڑھا، حضرت
ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ اس سے حضورؐ کا مقصد کیا تھا؟ انھوں
نے فرمایا کہ آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ کی اُمت تنگی میں مبتلا نہ ہو"

---

[1] جامع ترمذی، ج ۱ ص ۲۶،

اس حدیث کی بناء پر ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ظہر کی نماز عصر کے وقت میں اور مغرب کو عشاء کے وقت میں اکٹھا کرکے پڑھنا بغیر کسی سفر اور عذر کے بھی جائز ہے، اور چونکہ میرے امام مجتہد کا مسلک اس حدیث صریح کے خلاف ہے اس لئے میں مجتہد کا مسلک ترک کرکے حدیث پر عمل کرتا ہوں حالانکہ اس حدیث کا مطلب ائمۂ اربعہ اور اہل حدیث میں سے کسی کے نزدیک بھی یہ نہیں ہے کہ جمع بین الصلاتین بغیر عذر کے جائز ہے، بلکہ اس حدیث کو قرآن و سنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں صرف حنفیہؒ ہی نے نہیں بلکہ شافعیہؒ، مالکیہؒ، حنابلہؒ، بلکہ اہل حدیث حضرات نے بھی جمع صوری کے معنی پر محمول کیا ہے[۱] (یعنی یہ کہ آپؐ نے ظہر کی نماز بالکل آخر وقت میں اور عصر کی بالکل اول وقت میں پڑھی، اور اس طرح ظاہری اعتبار سے دونوں کی ادائیگی ایک ساتھ ہوگئی)

یہ دو مثالیں محض نمونے کے طور پر پیش کردی گئیں، ورنہ ایسی احادیث ایک دو نہیں بیسیوں ہیں، جن کو قرآن و سنت کے علوم میں کافی مہارت کے بغیر انسان دیکھے گا تو لامحالہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہوگا، اسی بناء پر علماء نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے علم دین باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو اُسے قرآن و حدیث کا مطالعہ ماہر استاذ کی مدد کے بغیر نہیں کرنا چاہئے،

پھر یہ بات بھی پیچھے عرض کی جا چکی ہے کہ کسی امام و مجتہد کی تقلید تو کی ہی اُس مقام پر جاتی ہے جہاں قرآن و سنت کے دلائل میں تعارض محسوس ہوتا ہے، لہٰذا اگر ایک مسئلے کے جواب میں امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا اختلاف ہے تو ان میں سے کوئی بھی دلیل سے خالی نہیں ہوتا، تقلید کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ جو شخص ان دلائل میں راجح و مرجوح کا فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہے وہ ان میں سے کسی ایک کا دامن پکڑ لے، اب اگر امام ابو حنیفہؒ کا دامن پکڑنے کے بعد اُسے کوئی ایسی حدیث نظر آجاتی ہے جس پر امام شافعیؒ نے اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے تو اس کا کام یہ

---

[۱] ملاحظہ ہو تحفۃ الاحوذی، للمبارکپوریؒ ج ۱ ص ۱۶۶ و ۱۶۷

نہیں کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کو چھوڑ دے، کیونکہ یہ تو پہلے ہی معلوم تھا کہ امام شافعیؒ کی بھی کوئی نہ کوئی دلیل ضرور ہوگی، لیکن ظاہر ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اس دلیل کو کسی اور دلیل کی بنیاد پر چھوڑا ہے جو اُن کے نزدیک زیادہ مضبوط اور قوی تھی، اس لئے ان کے مسلک کو حدیث کے خلاف نہیں کہا جا سکتا، اور جس درجے کے مقلد کی بات ہو رہی ہے اس کے اندر چونکہ دلائل کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں ہے اس لئے وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس کی دلیل قوی ہے؟ چنانچہ اس کا کام صرف تقلید ہے، اور اگر اسے کوئی حدیث اپنے امام کے مسلک کے خلاف نظر آئے تب بھی اُسے اپنے امام کا مسلک نہیں چھوڑنا چاہئے، بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ حدیث کا صحیح مفہوم یا اس کا صحیح محل میں سمجھ نہیں سکا۔

اس کی مثال بالکل یوں سمجھئے کہ دنیا میں آج جب بھی کسی شخص کو قانون کے بارے میں کوئی بات معلوم کرنی ہوتی ہے، تو وہ کسی ماہرِ قانون کی طرف رجوع کرتا ہے، قانون کی کتابیں براہِ راست دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا، اب اگر بالفرض وہ کسی ایسے ماہرِ قانون کے پاس جاتا ہے جس کی علمی مہارت اور تجربہ مسلّم ہو اور جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ یہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا، اور وہ ماہرِ قانون کسی قانونی نکتے کی وضاحت کرتا ہے، تو اس کا فرض یہ ہے کہ اس کی بات پر اعتماد کر کے اس پر عمل کرے، پھر اگر بالفرض اسے اتفاقاً قانون کی کوئی کتاب ہاتھ لگ جاتی ہے، اور اس کا کوئی جملہ اُسے بظاہر اُس ماہرِ قانون کی بتائی ہوئی بات کے خلاف محسوس ہوتا ہو تب بھی اس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ماہرِ قانون کی بات کو رَد کر دے، بلکہ اس کو عمل اسی ماہرِ قانون کی بات پر کرنا ہوگا، اور کتاب کے بارے میں یہ سمجھنا ہوگا کہ اس کا صحیح مطلب کچھ اور ہی، جو میں نہیں سمجھ سکا، وجہ یہ ہے کہ قانون کی کتابوں سے کوئی نتیجہ نکالنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے اُس فن کی مہارت اور وسیع تجربہ درکار ہے، یہ بات اس سے کہیں زیادہ صحت کے ساتھ قرآن و سنت پر صادق آتی ہے، کہ ان سے مسائلِ شرعیہ کا استنباط ان علوم کی زبردست مہارت

کا متقاضی ہے،

یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہا نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ عوام کو براہِ راست قرآن و حدیث سے احکامِ شریعت معلوم کرنے کے بجائے علماء و فقہاء کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، بلکہ فقہاء نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر کسی عام آدمی کو کوئی مفتی غلط فتویٰ دیدے تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا، عام آدمی کو معذور سمجھا جائے گا، لیکن اگر کوئی عام آدمی کوئی حدیث دیکھ کر اس کا مطلب غلط سمجھے اور اس پر عمل کرلے تو وہ معذور نہیں ہے، کیونکہ اس کا کام کسی مفتی کی طرف رجوع کرنا تھا، خود قرآن و سنّت سے مسائل کا استنباط اس کا کام نہ تھا،

مثلاً سینگی، پچھنے لگوانے سے جمہور علماء کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹتا، لیکن اگر کسی عام آدمی نے کسی مفتی سے مسئلہ پوچھا اور اس نے غلطی سے یہ بتادیا کہ روزہ ٹوٹ گیا، اور اس کے بعد اس شخص نے یہ سمجھکر کچھ کھاپی لیا، کہ روزہ تو ٹوٹ ہی چکا ہے تو ہدایہ میں لکھا ہے کہ اس پر صرف قضا آئے گی، کفارہ نہیں آئے گا، صاحبِ ہدایہ اس کی وجہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں: "لان الفتویٰ دلیل شرعی فی حقہ" (اس لئے کہ اس عام آدمی کے لئے مفتی کا فتویٰ دلیل شرعی ہے) لیکن اگر کسی شخص نے ابوداؤد یا ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث دیکھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں ایک شخص کے پاس سے گذرے جو سینگی لگوا رہا تھا، تو آپؐ نے فرمایا۔

افطر الحاجم والمحجوم[1]

سینگی لگانے والے اور لگوانے والے

دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا،

---

[1] یہ حدیث سنداً صحیح ہے، لیکن صحیح بخاریؒ میں ایک دوسری حدیث مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود روزے کی حالت میں سینگی لگوائی ہے، اور نسائی میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے، آپؐ نے روزہ دار کو سینگی لگوانے کی اجازت دی، ان احادیث کی بناء پر امام شافعیؒ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور جمہور علماء یہ کہتے ہیں کہ "افطر الحاجم والمحجوم" کا حکم یا تو منسوخ ہے،

اور اس حدیث سے اس نے یہ سمجھ کر کہ سینگی لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کچھ کھا پی لیا تو امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس پر کفارہ واجب ہوگا، کیونکہ اس کا فرض یہ تھا کہ وہ کسی مفتی سے مسئلہ پوچھتا، اور اس نے یہ فرض ادا نہیں کیا، امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:-

لان علی العامی الاقتداء بالفقہاء، لعدم الاھتداء فی حقہ الی معرفۃ الاحادیث[۱]

"عام آدمی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ فقہاء کی اقتداء کرے، اس لئے کہ وہ احادیث کا علم حاصل کرکے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا"

خلاصہ یہ ہے کہ عوام کے لئے تقلید کا پہلا درجہ متعین ہے، یعنی اُن کا کام یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے امام مجتہد کے قول پر عمل کریں، اور اگر انھیں کوئی حدیث امام کے قول کے خلاف نظر آئے تو اس کے بارے میں یہ سمجھیں کہ اس کا صحیح مطلب یا صحیح محمل ہم نہیں سمجھ سکے، اور جس امام کی ہم نے تقلید کی ہے انھوں نے اس کے ظاہری مفہوم کو کسی دوسری قوی دلیل کی بناء پر چھوڑا ہے، عوام کے لئے اس طرزِ عمل کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، ورنہ احکامِ شریعت کے معاملے میں جو شدید افراتفری برپا ہوگی اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا درجہ: متبحّر عالم کی تقلید

تقلید کا دوسرا درجہ "متبحّر عالم" کی تقلید ہے ... "متبحّر عالم" سے ہماری مراد ایسا شخص ہے جو اگرچہ رتبۂ اجتہاد تک نہ پہنچا ہو، لیکن اسلامی علوم کو باقاعدہ ماہر اساتذہ سے حاصل کرنے کے بعد انہی علوم کی تدریس و تصنیف کی خدمت میں اکابر علماء کے زیرِ نگرانی عرصۂ دراز تک مشغول رہا ہو، تفسیر، حدیث، فقہ اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یا آپ نے اُن خاص آدمیوں کو کوئی اور ایسا کام کرتے دیکھا ہوگا جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اس حدیث کی اور بھی متعدد توجیہات کی گئی ہیں، (دیکھئے تحفۃ الاحوذی، ج ۲ ص ۴۶ و ۶۵)

[۱] ھدایہ، ج ۱، ص ۲۲۶ باب مایوجب القضاء والکفارہ،

ان کے اصول ایسے مستحضر ہوں، اور وہ کسی مسئلے کی تحقیق میں اسلاف کے افادات سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتا ہو، اور ان کے طرزِ تصنیف و استدلال کا مزاج شناس ہونے کی بناء پر ان کی صحیح مراد تک پہونچ سکتا ہو، حضرت شاہ ولی اللہ رحمت اللہ علیہ ایسے شخص کو "متبحر فی المذہب" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور اس کے اوصاف اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

فصل فی المتبحر فی المذھب وھو الحافظ لکتب مذھبه ..... من شرطه ان یکون صحیح الفھم عارفاً بالعربیة واسالیب الکلام ومراتب الترجیح متفطناً لمعانی کلامھم لایخفی علیه غالباً تتبین مایکون مطلقاً فی الظاھر والمراد منه المقید والطلاق مایکون مقیداً فی الظاھر والمراد منه المطلق[1]

"متبحر فی المذہب وہ شخص ہے جو اپنے (امام مجتہد کے) مذہب کی کتابوں کا حافظ ہو... اس کی شرط یہ ہے کہ وہ صحیح الفہم ہو، عربی زبان اور اس کے اسالیب سے باخبر ہو، اور (امام مجتہد کے مختلف اقوال میں) ترجیح کے مراتب پہچانتا ہو، فقہاء کے کلام کے معانی خوب سمجھتا ہو، اور ایسی عبارتیں بظاہر مطلق ہوتی ہیں، لیکن ان میں کوئی قید ملحوظ ہوتی ہے، یا جو بظاہر مقید ہوتی ہیں لیکن ان سے مراد اطلاق ہوتا ہے وہ اس پر عمومی طور سے مخفی نہ رہ سکیں"

ایسا شخص بھی اگرچہ رتبۂ اجتہاد تک نہ پہنچنے کی وجہ سے مقلد ہی ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے مذہب کا مفتی بن سکتا ہے، ایسے شخص کی تقلید عوام کی تقلید سے مندرجہ ذیل امور میں مختلف ہوتی ہے،

(۱) اس قسم کا عالم عوام کی طرح صرف مذہب کے نہیں، بلکہ مذہب کے دلائل

---

[1] عقد الجید، ص ۵۱،

سے بھی کم از کم اجمالی طور پر واقف ہوتا ہے،

(۲) بحیثیت مفتی کے وہ اپنے مذہب کے مختلف اقوال میں سے اپنے زمانے اور عرف کے مطابق کسی ایک قول کو اختیار کرنے یا مذہب کی تشریح کا اہل ہوتا ہے، نیز جن نئے مسائل کی تصریح کتبِ مذہب میں نہیں ہی ان کا جواب مذہب ہی کے اصول و قواعد سے نکالتا ہے[۱]،

(۳) بعض خاص حالات میں وہ اپنے امام کے بجائے کسی دوسرے مجتہد کے قول کو اختیار کر کے اس پر فتویٰ دے سکتا ہے، جس کی شرائط اصولِ فقہ اور اصولِ فتویٰ کی کتابوں میں موجود ہیں[۲]،

ایسا شخص اگر کسی خاص مسئلے میں یہ محسوس کرے کہ جس امام کا وہ مقلد ہے اس کا قول کسی صحیح حدیث کے خلاف ہی، اور اس کے معارض کوئی قوی تر دلیل بھی نہیں ہے، تو اس کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

اذا وجد المتبحر فی المذهب حديثاً صحيحًا يخالف مذهبه فهل له ان ياخذ بالحديث ويترك مذهبه في تلك المسئلة؟ فی هذه المسئلة بحث طويل واطال فيها صاحب خزانة الروايات نقلاً عن دستور المساكين، فلنورد كلامه من ذلك بعينه[۳]،

"جب متبحر فی المذہب کو کوئی ایسی صحیح حدیث مل جائے جو اس کے مذہب کے خلاف ہو تو کیا اس کے لئے یہ جائز ہی کہ وہ حدیث پر عمل کرے، اور اس مسئلے میں اپنے مذہب کو چھوڑ دے؟ اس

---

[۱] ان کاموں کے مفصل اصول و قواعد کیلئے ملاحظہ ہو شرح عقود رسم المفتی، لابن عابدینؒ اور اصولِ فتویٰ کی دوسری کتابیں، [۲] اصولِ فتویٰ کی کتب کے علاوہ دیکھئے ردالمحتار للشامی ج ۲ ص ۹۰ اور ۹۱ کتاب الحدود، باب التعزیر، مطلب فیما اذا ارتحل الی غیر مذہبہ و ج ۳ ص ۲۰۰ کتاب السرقۃ مطلب یعذر بالعمل بمذہب الغیر الخ،

موضوع پر طویل بحثیں ہوئی ہیں اور خزانۃ الروایات کے مصنف
نے دستور المساکین سے نقل کرکے اس بارے میں طویل گفتگو کی ہے!
ہم یہاں ان کا کلام بعینہٖ نقل کرتے ہیں الخ!

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ علماء کے ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ "متبحر فی المذہب" چونکہ رتبۂ اجتہاد تک نہیں پہنچا، اس لئے مذکورہ صورت میں بھی اُسے اپنے امام کا مذہب نہیں چھوڑنا چاہئے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ امام مجتہد کی نظر ایسی دلیل کی طرف پہنچی ہو جہاں اس کی نظر نہیں گئی، لیکن بیشتر علماء کا کہنا یہ ہے کہ اگر ایسے "متبحر فی المذہب" نے مسئلے کے تمام پہلوؤں اور دلائل کا پوری طرح احاطہ کرنے کی کوشش کرلی ہو تو ایسی صورت میں وہ حدیث صحیح کی بناء پر اپنے امام کے قول کو چھوڑ سکتا ہے، لیکن اس کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے؛

(۱) پہلی شرط تو یہی ہے کہ وہ خود متبحر عالم ہو جس کی صفات شروع میں بیان کی گئی ہیں،

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ جس حدیث کی بناء پر وہ امام کا قول ترک کر رہا ہے اس کے بارے میں یہ اطمینان ہو کہ وہ تمام علماءِ حدیث کے نزدیک صحیح ہے، کیونکہ بعض اوقات کسی حدیث کی تصحیح میں مجتہدین کا اختلاف ہوتا ہے، جو حضرات اسے صحیح سمجھتے ہیں اُس پر عمل کرتے ہیں، اور جو حضرات اُسے ضعیف سمجھتے ہیں اُسے چھوڑ دیتے ہیں، ایسی صورت میں اگر مجتہد نے اس حدیث کو چھوڑا ہے تو ضعیف قرار دے کر چھوڑا ہے، لہٰذا ایک غیر مجتہد کے لئے اس پر عمل درست نہیں ہوگا،

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ اس حدیث کے معارض کوئی آیتِ قرآنی یا کوئی دوسری حدیث موجود نہ ہو،

(۴) اس حدیث کا مطلب بالکل صاف اور واضح ہو، اور اس کا کوئی دوسرا اطمینان بخش مطلب نہ نکل سکتا ہو، کیونکہ بسا اوقات ایک حدیث میں کئی معنی کا

احتمال ہوتا ہے، مجتہد اپنی اجتہادی بصیرت سے اس کے ایک معنی کو متعین کر دیتا ہے اس لئے اس کے مذہب کو حدیث کا مخالف نہیں کہا جا سکتا، ایسی صورت میں ایک مقلد کے لئے حدیث کا کوئی دوسرا مفہوم اختیار کرنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ تقلید کا تو حاصل ہی یہ ہے کہ جہاں قرآن وسنت کے ارشادات میں کئی معنی کا احتمال ہو وہاں بھی ایک معنی کو اختیار کرنے میں اپنی فہم کے بجائے کسی مجتہد کی فہم پر اعتماد کیا جائے، لہٰذا اس صورت میں مجتہد کی تقلید کرنے کو بھی حدیث کی مخالفت نہیں کہا جا سکتا۔[۱]

(۵) نیز یہ بھی ضروری ہے کہ اس طرح حدیث کی بناء پر جو قول اختیار کیا جائے وہ ائمہ اربعہ کے اجماع کے خلاف نہ ہو،[۲] کیونکہ ائمہ اربعہ کے مذاہب سے باہر جانے کے مفاسد پیچھے مفصل بیان ہو چکے ہیں،

ان شرائط کے ساتھ ایک متبحر عالم کے لئے اپنے امام کے قول کو چھوڑ دینا درست ہے، اس بارے میں اکابر علماء کی تصریحات مندرجہ ذیل ہیں:۔

شیخ الاسلام علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

قال الشیخ ابوعمرو فمن وجد من الشافعیۃ حدیثا یخالف مذھبہ نظر ان کملت آلات الاجتھاد فیہ مطلقا، او فی ذلک الباب او المسئلۃ کان لہ الاستقلال بالعمل بہ، وان لم یکمل وشق علیہ مخالفۃ الحدیث بعد ان بحث فلم یجد لمخالفتہ عنہ جوابا شافیا فلہ العمل بہ ان کان عمل بہ امام مستقل غیر الشافعی، ویکون ھذا عذرا لہ فی

---

[۱] یہ چاروں شرائط حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح کی کتاب "الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد" ص ۳۴ تا ۳۶ (جواب شبہ چہاردہم) و ص ۴۳ و ۴۴ (مقصد ہفتم) سے ماخوذ ہیں۔

[۲] یہ شرط عقد الجید، ص ۵۰ سے ماخوذ ہے،

ترك مذهب امامه هنا، وهذا الذي قاله حسن متعين[1]

"شیخ ابوعمرو (ابن الصلاح) فرماتے ہیں کہ اگر کسی شافعی المسلک شخص کو کوئی ایسی حدیث نظر آئے جو اس کے مذہب کے مخالف ہو تو دیکھا جائے، اگر اس شخص میں اجتہاد کی شرائط مطلقاً پائی جاتی ہوں، یا خاص اس باب میں یا خاص اُس مسئلے میں اُسے اجتہاد کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہو تو وہ اس حدیث پر عمل کر سکتا ہے، اور اگر اس میں شرائطِ اجتہاد پوری نہ ہوں، .... لیکن اس کو پوری جستجو کے بعد بھی حدیث کا کوئی شافی جواب نہ ملا ہو اور اس کو حدیث کی مخالفت گراں معلوم ہوتی ہو تو بھی وہ اس حدیث پر عمل کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس پر امام شافعیؒ کے علاوہ کسی دوسرے مستقل امام نے عمل کیا ہو، اور یہ بات اس کے لئے اس مسئلے میں اپنے امام کا مذہب ترک کرنے کا عذر بن جائے گی، (علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ) شیخ ابوعمرو (ابن الصلاح) کی یہ بات بہت اچھی ہے اور اسی پر عمل کرنا چاہئے"

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

والمختار ههنا هو قول ثالث، وهو ما اختاره ابن الصلاح وتبعه النووي وصححه[2] الخ

"اس مسئلے میں پسندیدہ قول تیسرا ہے، اور یہ وہ قول ہے جسے علامہ ابن الصلاحؒ نے اختیار کیا ہے، اور علامہ نوویؒ نے بھی اس کی متابعت کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے"

---

[1] المجموع شرح المهذب ج ۱ ص ۱۰۵، مقدمہ فصل فی قول الشافعی اذا صح الحدیث فہو مذہبی [2] عقد الجید ص ۵۰ فصل فی المتبحر فی المذہب

(اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے علامہ نوویؒ کی مذکورہ بالا عبارت نقل کی ہے)

اس کے علاوہ علمائے اصولِ فقہ کے درمیان یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے کہ "اجتہاد" متجزّی ہوتا ہے یا نہیں؟ یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص پوری شریعت میں تو مجتہد نہ ہو، لیکن کسی ایک مسئلے یا کسی ایک باب میں اس کو "اجتہاد" کا درجہ حاصل ہو جائے؟ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا، کیونکہ قوّتِ اجتہادیہ اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ انسان پوری شریعت پر مجتہدانہ نگاہ رکھتا ہو، لیکن علمائے اصول کی ایک بڑی جماعت اجتہاد میں تجزّی کی قائل ہے، چنانچہ علامہ تاج الدین سبکیؒ اور علامہ محلّیؒ لکھتے ہیں:-

(والصحیح جواز تجزئ الاجتهاد) بان تحصل لبعض الناس قوة الاجتهاد فی بعض الابواب کالفرائض بان یعلم ادلته باستقراء منه او من مجتهد کامل وینظر فیها،

"صحیح یہ ہے کہ اجتہاد متجزّی ہوتا ہے، یعنی بعض لوگوں کو بعض ابواب مثلاً فرائض میں قوّتِ اجتہادیہ حاصل ہو جاتی ہے، اور وہ اس طرح کہ وہ اس باب کے تمام دلائل کا ذاتی استقراء یا کسی مجتہدِ کامل کی مدد سے احاطہ کر لیتا ہے، اور ان دلائل میں غور کر کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے۔"

اور علامہ بنانیؒ شرح جمع الجوامع کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:-

ان الاجتهاد المذهبی قد یتجزأ، فربما یحصل لمن هو دون مجتهد الفتیا فی بعض المسائل[1]

[1] ان دونوں عبارتوں کے لئے ملاحظہ ہو حاشیۃ البنانیؒ علی شرح جمع الجوامع ج ۲ ص ۳۸۳ و ۳۸۴ مطبوعۃ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر،

اُجتہاد فی المذہب بعض اوقات جسزوی طور سے حاصل ہوجاتا ہے
چنانچہ یہ مرتبہ بعض مسائل میں ایسے لوگوں کو بھی مل جاتا ہے جو
مجتہد الفتیا سے بھی کم درجے کے ہوتے ہیں"
نیز علامہ عبدالعزیز بخاریؒ اصولِ فخرالاسلام بزدویؒ کی شرح میں لکھتے ہیں:

ولیس الاجتھاد عند العامۃ منصبًا لایتجزأ، بل یجوز ان یفوز العالم بمنصب الاجتھاد فی بعض الاحکام دون بعض[1]

"عام طور سے علماء کے نزدیک اجتہاد ایسا منصب نہیں ہے جو متجزّی نہ ہوسکے، بلکہ یہ ممکن ہے کہ کسی عالم کو بعض احکام میں منصبِ اجتہاد تک رسائی حاصل ہوجائے، اور بعض احکام میں نہ ہو"

اور امام غزالیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

ولیس الاجتھاد عندی منصبًا لایتجزأ بل یجوز ان یقال للعالم بمنصب الاجتھاد فی بعض الاحکام دون بعض[2]

"اور میرے نزدیک اجتہاد ایسا منصب نہیں ہے جو متجزّی نہ ہوسکے، بلکہ یہ ممکن ہے کہ کسی عالم کو بعض احکام میں منصبِ اجتہاد پر فائز کہا جائے اور بعض میں نہیں"

اور علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں:-

ثم ھذہ الشرائط انما ھی فی حق المجتھد المطلق

---

[1] کشف الاسرار لعبدالعزیز البخاریؒ، ج ۴ ص ۱۱۳۷، باب معرفۃ احوال المجتہدین،
[2] المستصفی، للغزالیؒ، ج ۲ ص ۱۰۳، القطب الرابع فی حکم المستثمر وھو المجتہد،

الذی یفتی فی جمیع الاحکام، واما المجتھد فی حکم دون حکم فعلیہ معرفۃ مایتعلق بذلک الحکم[1]

"پھر یہ شرائط تو مجتہد مطلق کے لئے ہیں، جو تمام احکام میں فتویٰ دینے کا اہل ہوتا ہو، رہا وہ شخص جو بعض احکام میں مجتہد ہو بعض میں نہ ہو، سو اس کو صرف ان باتوں کا علم حاصل ہونا ضروری ہے جو خاص اس حکم سے متعلق ہیں"

اس کے حاشیہ پر حضرت مولانا امیر علی صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

قولہ واما المجتھد فی حکم الخ فلابد من الاطلاع علی اصول مقلدہ لان استنباطہ علی حسبھا، فالحکم الجدید اجتھاد فی الحکم والدلیل الجدید للحکم المروی تخریج[2]

"جو شخص بعض مسائل میں مجتہد ہو اور بعض میں نہ ہو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس امام کا وہ مقلد ہو اس کے اصول استنباط سے واقف ہو، اس لئے کہ اس کا استنباط انہی اصول و قواعد کے ماتحت ہوگا، لہٰذا اس طرح اگر کوئی نیا حکم نکالا جائے تو وہ اجتہاد فی الحکم کہلائے گا، اور جو حکم مجتہد سے منقول ہو اس کی نئی دلیل بیان کی جائے تو اسے تخریج کہا جائے گا"

اور علامہ ابن الہمامؒ نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے کہ اجتہاد متجزّی ہو سکتا ہو، چنانچہ انھوں نے تصریح فرمائی ہے کہ جو شخص مجتہد مطلق نہ ہو اس پر تقلید صرف انہی مسائل میں واجب ہو جن میں اس کو اجتہاد کا مرتبہ حاصل نہ ہوا ہو،

---

[1] التلویح مع التوضیح ج ۲ ص ۱۱۸ طبع مصر، [2] التوشیح علی التلویح، لمولانا امیر علیؒ ص ۴۰۴ باب الاجتہاد، مطبوعہ نولکشور،

ان کی عبارت امیر بادشاہ بخاریؒ کی شرح کے ساتھ درج ذیل ہے:۔

(غیر المجتھد المطلق یلزمہ) عند الجمھور (التقلید وان کان مجتھداً فی بعض مسائل الفقہ او بعض العلوم) ..... (کالفرائض) .... (علی القول بالتجزی) للاجتھاد: ای یلزمہ التقلید بناءً علی القول بان الاجتھاد یتجزأ فیجوز ان یکون شخص مجتھداً فی بعض المسائل دون بعض (وھو الحق) ای القول بالتجزی وھو الحق، وانہ علیہ الاکثر (فیما لایقدر علیہ من الاحکام) متعلق بالتقلید[۱]

اور علامہ زین الدین ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بعینہٖ یہی بات تحریر فرمائی ہے[۲] البتہ علامہ ابن امیر الحاجؒ نے علامہ زملکانیؒ سے نقل کرکے اس مسئلے میں قول فیصل یہ بتایا ہے کہ اجتہاد کی جو شرائط کلی نوعیت کی ہیں، مثلاً قوتِ استنباط، اسالیب کلام کی معرفت اور دلائل کے ردّ و قبول کے بنیادی اصول کا سمجھنا یہ تو متجزی نہیں ہیں لہٰذا ان کا پایا جانا جزوی اجتہاد کے لئے بھی ضروری ہے، البتہ ہر ہر مسئلے کے تفصیلی دلائل میں محاکمہ کی اہلیت متجزی ہوتی ہے، چنانچہ اس کا بعض مسائل میں پایا جانا اور بعض میں نہ پایا جانا ممکن ہے[۳]

---

[۱] تیسیر التحریر لامیر بادشاہ البخاریؒ ج ۴ ص ۲۴۶ مصطفےٰ البابی مصر ۱۳۵۱ھ، [۲] فتح الغفار بشرح المنار لابن نجیمؒ مصطفےٰ البابی مصر ۱۳۵۵ھ ج ۳ ص ۳۷، [۳] فما کان من الشروط کلیاً کقوۃ الاستنباط و معرفۃ مجاری الکلام وما یقبل من الادلۃ وما یرد ونحوہ فلا بد من استجماعہ بالنسبۃ الی کل دلیل و مدلول فلا تتجزأ تلک الاہلیۃ وما کان خاصاً بمسئلۃ او باب فاذا استجمعہ الانسان کان فرضہ فی ذلک الجزء الاجتہاد، (التقریر والتحبیر لابن الامیر الحاج، ج ۳ ص ۲۹۴)

بہرحال علمائے اصول کی مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں ایک متبحر عالم اگر کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں اور ان کے دلائل کا احاطہ کرلے کے بعد کم از کم اُس مسئلہ میں اجتہاد کے درجہ تک پہنچ گیا ہو (خواہ وہ پوری شریعت میں مجتہد نہ ہو) تو وہ یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ میرے امام مجتہد کا مسلک فلاں حدیثِ صحیح کے خلاف ہے، ایسے موقع پر اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ امام کے قول کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرے، فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں :۔

> "الغرض بعد ثبوت اس امر کے کہ یہ مسئلہ اپنے امام کا خلاف کتاب و سنّت کے ہے ترک کرنا ہر مؤمن کو لازم ہے، اور کوئی بعد وضوح اس امر کے اس کا منکر نہیں، مگر عوام کو یہ تحقیق ہی کیونکر ہو سکتا ہے؟[۵۱]

اور اس مسئلے کی بہترین تحقیق حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمادی ہے، جسے اس موضوع پر حرفِ آخر کہنا چاہئے، یہاں ہم ان کی پوری عبارت تطویل سے بے پروا ہو کر نقل کرتے ہیں، کیونکہ یہ عبارت پوری مغز ہی مغز ہے، فرماتے ہیں :۔

> "جس مسئلے میں کسی عالم وسیع النظر، ذکی الفہم، منصف مزاج کو اپنی تحقیق سے یا کسی عامی کو ایسے عالم سے بشرطیکہ متقی بھی ہو بشہادتِ قلب معلوم ہو جاوے کہ اس مسئلہ میں راجح دوسری جانب ہے تو دیکھنا چاہئے کہ اس مرجوح جانب میں بھی دلیلِ شرعی سے عمل کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر گنجائش ہو تو ایسے موقع پر جہاں احتمال فتنہ و تشویش عوام کا ہو مسلمانوں کو تفریقِ کلمہ سے بچانے کے لئے اَولیٰ یہی ہے کہ اس مرجوح جانب پر عمل کرے، دلیل اس کی یہ حدیثیں ہیں......
>
> حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ مجھ سے ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم کو معلوم نہیں کہ تمہاری قوم یعنی قریش نے جب

---

[۵۱] سبیل الرشاد، از حضرت گنگوہیؒ ص ۳۰ و ۳۱ مطبوعہ دہلی ۱۳۵۲ھ

کعبہ بنایا ہے تو بنیادِ ابراہیمی سے کمی کر دی ہے، میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! پھر آپ اسی بنیاد پر تعمیر کرا دیجئے، فرمایا کہ اگر قریش کا زمانہ کفر سے قریب نہ ہوتا تو میں ایسا ہی کرتا..... یعنی لوگوں میں خوامخواہ تشویش پھیل جاوے گی کہ دیکھو! کعبہ گرا دیا، اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کرتا، دیکھئے! باوجودیکہ جانبِ راجح یہی تھی کہ قواعدِ ابراہیمی پر تعمیر کر دیا جاتا مگر چونکہ دوسری جانب بھی یعنی ناتمام رہنے دینا بھی شرعاً جائز تھی، گو مرجوح تھی، آپ نے بخوفِ فتنہ و تشویش اسی جانب مرجوح کو اختیار فرمایا...... (نیز) حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے (سفر میں) فرض چار رکعت پڑھی، کسی نے پوچھا کہ تم نے حضرت عثمانؓ پر (قصر نہ کرنے میں) اعتراض کیا تھا پھر خود چار پڑھی؟ آپ نے جواب دیا کہ خلاف کرنا موجبِ شر ہے... اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ باوجودیکہ ابن مسعودؓ کے نزدیک جانبِ راجح سفر میں قصر کرنا ہے، مگر صرف شر و خلاف سے بچنے کے لئے اتمام فرما لیا جو جانب مرجوح تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی جائز سمجھتے تھے، بہر حال ان حدیثوں سے اس کی تائید ہو گئی کہ اگر جانبِ مرجوح بھی جائز ہو تو اسی کو اختیار کرنا اولیٰ ہے۔

اور اگر اس جانب مرجوح میں گنجائش عمل نہیں بلکہ ترک واجب یا ارتکابِ امر ناجائز لازم آتا ہے، اور بجز قیاس کے اس پہ کوئی دلیل نہیں پائی جاتی، اور جانب راجح میں حدیث صحیح صریح موجود ہے، اس وقت بلا تردد حدیث پر عمل کرنا واجب ہوگا، اور اس مسئلے میں کسی طرح تقلید جائز نہ ہو گی، کیونکہ اصلِ دین قرآن و حدیث ہے، اور تقلید سے یہی مقصود ہے کہ قرآن و حدیث پر سہولت

وسلامتی سے عمل ہو، جب دونوں میں موافقت نہ رہی قرآن و
حدیث پر عمل ہوگا، ایسی حالت میں بھی اسی پر جمے رہنا یہی
تقلید ہے جس کی مذمت قرآن وحدیث و اقوالِ علماء میں آئی ہے،
. . . . لیکن اس مسئلے میں ترکِ تقلید کے ساتھ بھی کسی مجتہد کی
شان میں گستاخی و بدزبانی کرنا یا دل سے بدگمانی کرنا کہ انھوں نے
اس حدیث کی مخالفت کی ہے جائز نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ اُن کو
یہ حدیث نہ پہنچی ہو یا بہ سند ضعیف پہنچی ہو یا اسکو کسی قرینۂ شرعیہ سے ماؤّل سمجھا ہو
اس لئے وہ معذور ہیں، اور حدیث نہ پہونچنے سے اُن کے کمالِ علمی
میں طعن کرنا بھی بدزبانی میں داخل ہے، کیونکہ بعض حدیثیں اکابر
صحابہؓ کو جن کا کمالِ علمی مسلّم ہے کسی وقت تک نہ پہنچی تھیں، مگر
اُن کے کمالِ علمی میں اس کو موجبِ نقص نہیں کہا گیا، . . . . .

اسی طرح مجتہد کے اُس مقلّد کو جس کو اب تک اس شخص مذکور
کی طرح اس مسئلے میں شرحِ صدر نہیں ہوا، اور اس کا ابتک بھی حسنِ
ظن ہے کہ مجتہد کا قول خلافِ حدیث نہیں ہے، اور وہ اس گمان
سے ابتک اس مسئلے میں تقلید کر رہا ہے اور حدیث کو رَد نہیں کرتا
لیکن وجہ موافقت کو مفصّل سمجھتا بھی نہیں تو ایسے مقلّد کو بھی بوجہ
اس کے کہ وہ بھی دلیلِ شرعی سے متمسک ہے، اور اتباعِ شرع
ہی کا قصد کر رہا ہے بُرا کہنا جائز نہیں،

اسی طرح اُس مقلّد کو اجازت نہیں کہ ایسے شخص کو بُرا کہے کہ
جس نے بعذرِ مذکور اس مسئلے میں تقلید ترک کر دی ہے، کیوں کہ
اُن کا یہ اختلاف ایسا ہے جو سلف سے چلا آیا ہے، جس کے باب میں
علماء نے فرمایا ہے کہ اپنا مذہب ظنّاً صواب محتملِ خطاء، اور دوسرا
مذہب ظنّاً خطاء محتملِ صواب ہے، جس سے یہ شبہ بھی دفع ہو جاتا

ہو کہ جب سب حق ہیں تو ایک ہی پر عمل کیوں کیا جاوے؟ پس
جب دوسرے میں بھی احتمالِ صواب ہو تو اس میں کسی کی تضلیل یا
تفسیق یا بدعتی، وہابی کا لقب دینا اور حسد و بغض و عناد و نزاع و
غیبت و سب و شتم، و طعن و لعن کا شیوہ اختیار کرنا جو قطعاً
حرام ہیں کس طرح جائز ہوگا؟

البتہ جو شخص عقائد یا اجماعیات میں مخالفت کرے، یا سلفِ
صالحین کو بُرا کہے وہ اہل سنت والجماعت سے خارج ہے، کیونکہ
اہلِ سنت وجماعت وہ ہیں جو عقائد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے
طریقے پر ہوں، اور یہ امور اُن کے عقائد کے خلاف ہیں، لہٰذا ایسا
شخص اہلِ سنت سے خارج اور اہلِ بدعت و ہویٰ میں داخل ہے،
اسی طرح جو شخص تقلید میں غلو کرے کہ قرآن و حدیث کو رَد کرنے
لگے، ان دونوں قسم کے شخصوں سے حتی الامکان اجتناب و احتراز
لازم سمجھیں اور مجادلہ، متعارفہ سے بھی اعراض کریں[1]؛

حقیقت یہ ہے کہ اس عبارت میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی توفیقِ خاص سے اس مسئلے کے بارے میں وہ راہِ اعتدال بتا دی ہے جس پر عمل کر لیا جائے تو مسلمانوں کے کتنے باہمی نزاعات ختم ہو جائیں،

بہرحال مذکورہ بالا شرائط اور تفصیلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک متبحر عالم کسی خاص مسئلے میں اپنے امام کے قول کو صحیح و صریح حدیث کی بنیاد پر ترک کر سکتا ہے، لیکن اس طرح جزوی طور پر اپنے امام سے اختلاف کرنے کے باوجود مجموعی طور پر اُسے مقلّد ہی کہا اور سمجھا جاتا ہے، چنانچہ بہت سے فقہاء حنفیہ نے اسی بناء پر امام ابوحنیفہؒ کے قول کو ترک کر کے دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دیا ہے، مثلاً انگور

---

[1] الاقتصاد فی التقلید و الاجتہاد، از حضرت تھانویؒ، ص ۴۲ تا ۴۵ مقصد ہفتم،

کی شراب کے علاوہ دوسری نشہ آور اشیاء کو اتنا کم پینا جس سے نشہ نہ ہو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قوت حاصل کرنے کے لئے جائز ہے، لیکن فقہاء حنفیہؒ نے اس مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کو چھوڑ کر جمہور کا قول اختیار کیا ہے، اسی طرح مزارعت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ناجائز ہے، لیکن فقہاء حنفیہؒ نے امام صاحبؒ کے مسلک کو چھوڑ کر متناسب حصۂ پیداوار کی مزارعت کو جائز قرار دیا ہے،

اور یہ مثالیں تو ان مسائل کی ہیں جن میں تمام متاخرین فقہاء حنفیہ امام صاحبؒ کے قول کو ترک کرنے پر متفق ہو گئے، اور ایسی مثالیں تو بہت سی ہیں جن میں بعض فقہاؒ نے انفرادی طور پر کسی حدیث کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کے قول کی مخالفت کی ہے،

البتہ یہ مسئلہ انتہائی نازک ہے، اس لئے اس میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے، اور ہر شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو متبحر علماء کی صف میں شمار کر کے اس منصب پر فائز ہو جائے، اور اوپر جو شرائط بیان کی گئی ہیں، اُن کی رعایت رکھے بغیر احکام شرعیہ میں تصرف شروع کر دے،

تیسرا درجہ، مجتہد فی المذہب کی تقلید

تقلید کا تیسرا درجہ "مجتہد فی المذہب" کی تقلید ہے، "مجتہد فی المذہب" اُن حضرات کو کہتے ہیں جو استدلال و استنباط کے بنیادی اصولوں میں کسی مجتہد مطلق کے طریقے کے پابند ہوتے ہیں، لیکن اُن اصول و قواعد کے تحت جزوی مسائل کو براہِ راست قرآن و سنت اور آثارِ صحابہؓ وغیرہ سے مستنبط کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، چنانچہ ایسے حضرات اپنے مجتہد مطلق سے بہت سے فروعی احکام میں اختلاف رکھتے ہیں، لیکن اصول کے لحاظ سے اس کے مقلد کہلاتے ہیں، مثلاً فقہِ حنفی میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ، فقہِ شافعیؒ میں امام مزنیؒ اور اما ابو ثورؒ، فقہِ مالکیؒ میں سحنونؒ اور ابن القاسمؒ، اور فقہِ حنبلیؒ میں ابراہیم الحربیؒ اور ابو بکر الاثرمؒ،

علامہ ابن عابدین شامیؒ ان حضرات کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:-

الثانية طبقة المجتهدين فی المذهب کابی یوسفؒ و

محمدؒ وسائر اصحاب ابی حنیفةؒ القادرین علی استخراج الاحکام عن الادلّة المذکورة علی حسب القواعد التی قررھا استاذھم، فانھم وان خالفوہ فی بعض احکام الفروع ولکنھم یقلّدونہ فی قواعد الاصول[1]

"فقہاء کا دوسرا طبقہ مجتہدین فی المذہب ہے، مثلاً امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، اور امام ابوحنیفہؒ کے دوسرے اصحاب جو مذکورہ دلائل (یعنی قرآن وسنّت اور اجماع وقیاس) سے اُن قواعد کے مطابق احکام مستنبط کرنے پر قادر ہوتے ہیں، جو اُن کے استاذ نے مقرّر کئے ہوں، اس لئے کہ ان حضرات نے اگرچہ اپنے امام سے بہت فروعی مسائل میں اختلاف کیا ہے، لیکن قواعدِ اصول میں وہ اپنے امام کے مقلّد ہیں"

لہٰذا مجتہد فی المذہب اصول کے لحاظ سے مقلّد اور فروع کے لحاظ سے مجتہد ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ وغیرہ نے حنفی ہونے کے باوجود امام ابو حنیفہؒ سے بے شمار فروعی مسائل میں اختلاف کیا ہے،

چوتھا درجہ، مجتہد مطلق کی تقلید

تقلید کا آخری درجہ "مجتہد مطلق" کی تقلید ہے، "مجتہد مطلق" وہ شخص ہے جس میں تمام شرائطِ اجتہاد پائی جاتی ہوں، اور وہ اپنے علم وفہم کے ذریعہ اصولِ استدلال بھی خود قرآن وسنت سے وضع کرنے پر قادر ہو، اور ان اصول کے تحت تمام احکامِ شریعت کو قرآن کریم سے مستنبط بھی کرسکتا ہو جیسے امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ وغیرہ، یہ حضرات اگرچہ اصول اور فروع دونوں میں مجتہد

---

[1] شرح عقود رسم المفتی، لابن عابدینؒ، ص ۴ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی ۱۳۷۵ھ ،

ہوتے ہیں، لیکن ایک طرح کی تقلید ان کو بھی کرنی پڑتی ہے، اور وہ اس طرح کہ جن مسائل میں قرآن کریم یا سنتِ صحیحہ میں کوئی تصریح نہیں ہوتی وہاں یہ حضرات اکثر و بیشتر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ خالصۃً اپنی رائے اور قیاس سے فیصلہ کرنے کے بجائے صحابہؓ و تابعین میں سے کسی کا کوئی قول یا فعل مل جائے، چنانچہ اگر ایسا کوئی قول و فعل مل جاتا ہے تو یہ حضرات بھی اس کی تقلید کرتے ہیں، قرونِ اُولیٰ میں اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں :۔

(۱) اس طرزِ عمل کی اصل حضرت عمرؓ کا وہ مکتوب ہے جو انھوں نے قاضی شریح کے نام لکھا تھا، امام شعبیؒ فرماتے ہیں :۔

عن شریح ان عمر بن الخطابؓ کتب الیہ : ان جاءک شیئ فی کتاب اللہ فاقض بہ، ولا یلفتنك عنہ الرجال فان جاءك مالیس فی کتاب اللہ فانظر سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاقض بھا فان جاءك مالیس فی کتاب اللہ ولم یکن فیہ سنۃ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانظر ما اجتمع علیہ الناس فخذ بہ فان جاءك مالیس فی کتاب اللہ ولم یکن فی سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یتکلم فیہ احد قبلك فاختر ای الامرین شئت، ان شئت ان تجتھد برایك ثم تقدم فتقدم وان شئت ان تتأخر فتأخر ولا أری التأخر الا خیرا لك۔[1]

"حضرت شریحؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا : اگر تمھارے پاس کوئی ایسا مسئلہ آئے جس کا جواب کتاب اللہ میں موجود ہے

---

[1] سنن الدارمیؒ ج ۱ ص ۵۵ باب الفتیا وما فیہ من الشدۃ، مطبوعہ مدینہ منورہ ۱۳۸۶ھ

تو اس کے مطابق فیصلہ کرو اور ایسی صورت میں لوگوں کی ذاتی آراء تمھیں اس سے برگشتہ نہ کریں، اور اگر تمھارے پاس کوئی ایسا مسئلہ آئے جو کتاب اللہ میں نہیں ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو دیکھو، اور اس کے مطابق فیصلہ کرو، اور اگر تمھارے پاس کوئی ایسا مسئلہ آئے جس کا جواب نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت موجود ہو تو ایسی بات تلاش کرو جس پر پچھلے لوگ متفق رہے ہوں، اور اس پر عمل کرو، اور اگر تمھارے پاس کوئی ایسا مسئلہ آئے جو کتاب اللہ میں نہیں ہے، اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ہو اور اس کے بارے میں تم سے پہلے کسی (فقیہ) نے کلام نہیں کیا تو دو باتوں میں سے جس کو چاہو اختیار کر لو، اگر اپنی رائے سے اجتہاد کر کے اقدام کرنا چاہو تو کر لو، اور اگر ایسے معاملے کے فیصلے پیچھے ہٹنا چاہو تو ہٹ جاؤ، اور تمھارے لئے میں پیچھے ہٹنے کو بہتر ہی بہتر سمجھتا ہوں"

ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت شریح مجتہدِ مطلق تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے اُن کو اپنی ذاتی اجتہادی رائے پر عمل کرنے کا مشورہ اس وقت دیا جب انھیں اس مسئلے میں اسلاف میں سے کسی کا قول نہ ملے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک اسی قسم کا ارشاد پیچھے "تقلیدِ مطلق" کی مثالوں میں گذر چکا ہے،

(۲) نیز سننِ دارمیؒ ہی میں عبداللہ بن ابی یزیدؒ فرماتے ہیں :-

کان ابن عباسؓ اذا سئل عن الامر فکان فی القرآن اخبر به، وان لم یکن فی القرآن، وکان عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اخبر به فان لم یکن فعن ابی بکر وعمر فان لم یکن قال فیه برأیه ؕ ل

له سنن دارمی ج ۱ ص ۵۱

حضرت ابن عباسؓ سے جب کسی معاملے میں سوال کیا جاتا، اور قرآن کریم میں اس کا جواب ہوتا تو اس کے مطابق جواب دیدیتے اور اگر قرآن نہ ہوتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ہوتی تو اس کے مطابق جواب دیدیتے، اور اگر سنّت میں بھی نہ ہوتا اور حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ سے کوئی بات ثابت ہوتی تو اس کے مطابق جواب دیتے، اور اگر وہاں بھی نہ ہوتا تو اپنے اجتہاد اور رائے سے کام لیتے "

حضرت عبداللہ بن عباسؓ خود مجتہد مطلق تھے، لیکن اپنی اجتہادی رائے سے جواب دینے کے بجائے پہلے حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ کی تقلید کی کوشش فرماتے تھے،

(۳) نیز سنن دارمی ہی میں روایت ہے :-

عن الشعبی قال: جاءہ رجل فسألہ عن شئ، فقال: کان ابن مسعود یقول فیہ کذا وکذا، قال: اخبرنی انت برأیك، فقال: الا تعجبون من هذا! اخبرتہ عن ابن مسعودؓ ویسألنی عن رأیی، ودینی عندی اٰثر من ذلك، واللہ لان اتغنی اغنیۃ احبّ الیّ من ان اخبرك برأیی[1]

"امام شعبیؒ کے پاس ایک شخص آیا اور کوئی مسئلہ دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا کہ اس مسئلے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد یہ ہے، اس شخص نے کہا، آپ مجھے اپنی رائے بتائیے، امام شعبیؒ نے لوگوں سے کہا تمہیں اس شخص پر حیرت نہیں ہوتی! میں نے اس کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا فتویٰ بتایا ہے، اور یہ

---

[1] سنن الدارمیؒ، ج ۱ ص ۴۷ باب التورّع عن الجواب فیما لیس فیہ کتاب ولا سنّۃ،

مجھ سے میری رائے پوچھتا ہو، میرا دین میرے نزدیک (اس کی
خواہش کی تکمیل سے) زیادہ قابلِ ترجیح ہے، خدا کی قسم! مجھے گلے
گا تا پھرنا زیادہ پسند ہو کہ میں تمہارے سامنے (حضرت عبداللہ
ابن مسعودؓ کے مقابلے میں) اپنی ذاتی رائے بیان کروں"

یہاں بھی امام شعبیؒ مجتہد مطلق (اور امام ابوحنیفہؒ کے استاذ) ہیں، لیکن اپنی اجتہادی رائے کے مقابلے میں وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تقلید کو زیادہ پسند فرماتے تھے،

(۴) امام بخاریؒ نے کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ میں آیتِ قرآنی "واجعلنا للمتقین اماما" کی تفسیر کے طور پر حضرت مجاہدؒ کا یہ قول تعلیقاً نقل کیا ہے کہ:-

ائمۃ نقتدی بمن قبلنا ویقتدی بنا من بعدنا۔

"(یا اللہ ہمیں) ایسا امام بنا کہ ہم اپنے سے پہلے لوگوں کی اقتدا کریں
اور ہمارے بعد آنے والے ہماری اقتداء کریں"

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مجاہدؒ کا ارشاد ہے، جسے حافظ ابن جریرؒ اور فریابیؒ وغیرہ نے صحیح سند سے روایت کیا ہے، پھر حافظؒ نے اسی آیت کی تفسیر میں اور بہت سے آثار نقل کرنے کے بعد ابن ابی حاتمؒ کے حوالہ سے سُدّی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ:-

لیس المراد ان نؤم الناس وانما ارادوا اجعلنا ائمۃ
لھم فی الحلال والحرام یقتدون بنا فیہ،

"مراد یہ نہیں ہو کہ ہم لوگوں کی امامت کریں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ
یا اللہ ہمیں حلال وحرام کے معاملے میں اُن کا امام بنا دے کہ وہ
ہماری اقتداء کریں"

اور ابن ابی حاتمؒ ہی نے جعفر بن محمدؒ کا یہ قول بھی روایت کیا ہے؛

معناہ اجعلنی رضا فاذا قلت صدقونی وقبلوا منی [1]
"مطلب یہ ہے کہ مجھے لوگوں میں مقبولیت عطا کیجئے کہ جب میں کوئی
بات کہوں تو لوگ اس کی تصدیق کریں اور میری بات قبول کریں"

بہرحال: ان آثار کا ذکر تو استطراداً آگیا، اصل مقصد یہ تھا کہ حضرت مجاہدؒ مجتہد مطلق تھے، لیکن انھوں نے بھی اپنے سے پہلے لوگوں کی اقتدار کو پسند فرمایا، جو مجتہدِ مطلق کی تقلید کی مثال ہے، اور اپنے بعد کے لوگوں کے لئے اپنی اقتدار کو پسند فرمایا جو عام علماء اور عوام کی تقلید کی مثال ہے:

---

[1] فتح الباری للحافظ ابن حجرؒ، ج ۱۳ ص ۲۱۰ و ۲۱۱ طبع میریہ

تقلید پر شبہات و اعتراضات

گزشتہ صفحات میں تقلید کی جو حقیقت واضح کی گئی ہے، قرآن و سنت سے اس کی جو نظائر پیش کی گئی ہیں، اور اس کے مختلف درجات کے جو احکام بتائے گئے ہیں اُن کو اچھی طرح پیشِ نظر رکھا جائے تو تقلید پر وارد کئے جانے والے بہت سے اعتراضات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض اُن اعتراضات کا جواب خاص طور سے ذکر کر دیا جائے جو کثرت سے دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں یا جو عام طور پر تقلید کے مخالف حضرات کے زبان زد رہتے ہیں،

قرآن میں آباء و اجداد کی تقلید

(۱) تقلید پر پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے بہ الفاظ ذیل تقلید کی مذمت فرمائی ہے:

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝

"اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں اُن کی پیروی کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اُن باتوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے، (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) بھلا اگر ان کے باپ دادا ذرا عقل و ہدایت نہ رکھتے ہوں تب بھی؟"

لیکن جو گذارشات ہم نے پچھلے صفحات میں پیش کی ہیں اگر اُن کی روشنی میں بہ نظرِ انصاف

غور کیا جائے تو یہ شبہ خود بخود دور ہو جاتا ہے کہ ائمۂ مجتہدین کی تقلید (معاذ اللہ) مذکورہ آیت کے خلاف ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم کی اس آیت میں دین کے بنیادی عقائد کا ذکر ہو رہا ہے، یعنی مشرکین، توحید، رسالت، اور آخرت جیسے مسائل میں حق کو قبول کرنے کے بجائے صرف یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو انہی عقائد پر پایا ہے، گویا اُن کی تقلید دین کے بنیادی عقائد میں تھی، اور دین کے بنیادی عقائد میں تقلید ہمارے نزدیک بھی جائز نہیں ہے، تمام اصولِ فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کہ تقلید عقائد اور ضروریاتِ دین میں نہیں ہوتی، کیونکہ یہ مسائل نہ اجتہاد کا محل ہیں، نہ تقلید کا، مثلاً علامہ امیر بادشاہ بخاریؒ تحریر الاصول کی شرح میں لکھتے ہیں :-

(فمایحل الاستفتاء فیہ) الاحکام (الظنیۃ لا العقلیۃ المتعلقۃ بالاعتقاد فان المطلوب فیھا العلم (علی) المذھب (الصحیح) فلا یجوز التقلید فیھا، بل یجب تحصیلھا بالنظر الصحیح)... (کوجودہ تعالیٰ)[1]

"جن مسائل میں استفتاء کرنا جائز ہے وہ ظنی احکام ہیں، نہ کہ وہ عقلی احکام جو اعتقاد سے متعلق ہیں، اس لئے کہ وہاں قطعی علم درکار ہے، چنانچہ صحیح مذہب یہی ہے کہ بنیادی عقائد میں تقلید جائز نہیں، بلکہ اُن عقائد کو صحیح استدلال کے ذریعہ اختیار کرنا ضروری ہے، مثلاً وجودِ باری تعالیٰ"

لہٰذا جس تقلید کی مذمت مذکورہ آیت نے کی ہے اُسے ائمۂ مجتہدین کے مقلد حضرات بھی ناجائز کہتے ہیں، چنانچہ علامہ خطیب بغدادیؒ نے اصولِ عقائد میں تقلید کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔[2]

---

[1] تیسیر التحریر، لامیر بادشاہ الحنفیؒ ج ۴ ص ۲۴۳، مزید دیکھئے التقریر والتحبیر لابن امیر الحاج ج ۳ ص ۳۴۳، [2] الفقیہ والمتفقہ، للخطیب البغدادیؒ ج ۲ ص ۶۶۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باپ دادوں کی تقلید پر مذمت کے دو سبب بھی بیان فرما دیئے ہیں، ایک یہ کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کو برملا رد کر کے انھیں نہ ماننے کا اعلان کرتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ ہم اس کے بجائے اپنے باپ دادوں کی بات مانیں گے، دوسرے یہ کہ اُن کے آباء و اجداد عقل و ہدایت سے کورے تھے،

لیکن ہم جس تقلید کی گفتگو کر رہے ہیں، اس میں یہ دونوں سبب مفقود ہیں، کوئی تقلید کرنے والا خدا اور رسول کے احکام کو رد کر کے کسی بزرگ کی بات نہیں مانتا، بلکہ وہ اپنے امام مجتہد کو قرآن و سنت کا شارح قرار دے کر اُس کی تشریح کی روشنی میں قرآن و سنت پر عمل کرتا ہے، اسی طرح دوسرا سبب بھی یہاں نہیں پایا جاتا، کیونکہ اس سے کوئی اہلِ حق انکار نہیں کر سکتا کہ جن ائمہ مجتہدین کی تقلید کی جاتی ہے، اُن سے کتنا ہی اختلافِ رائے کیوں نہ ہو، مگر ہر اعتبار سے اُن کی جلالتِ قدر ہر ایک کو مسلم ہے، اس لئے اس تقلید کو کافروں کی تقلید پر منطبق کرنا بڑے ظلم کی بات ہے،

احبار و رہبان کی تقلید

(۲) بعض حضرات ائمہ مجتہدین کی تقلید پر اس آیت کو چسپاں فرماتے ہیں کہ:-

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ،

"انھوں نے اپنے علماء اور تارک الدنیا زاھدوں کو اللہ کے بجائے اپنا پروردگار بنا رکھا ہے"

لیکن ہم پیچھے تفصیل کے ساتھ عرض کر چکے ہیں کہ کسی مجتہد کی تقلید یا اطاعت شارع یا قانون ساز کی حیثیت سے نہیں کی جاتی، بلکہ اُسے شارحِ قانون قرار دے کر کی جاتی ہے، اسے اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الاتباع قرار نہیں دیا جاتا، بلکہ اس کی بیان کردہ تشریحات پر اعتماد کر کے قرآن و سنت کی پیروی کی جاتی ہے،

اس کے جواب میں حضرت مولانا محمد اسمٰعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ نے احقر کے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"یہ بالکل اسی قسم کا فقرہ ہے جو ہمارے بریلوی حضرات فرماتے ہیں ہم اہلِ قبور اور خانقاہوں کو مستقل بالذات خدا نہیں سمجھتے، بلکہ ان کو خدا کے نائب یا مجاز سمجھتے ہیں، پھر ادب، وسیلہ، شفاعت وغیرہ عنوانات کے ماتحت شرک کی شاہراہیں کھول دی جاتی ہیں"[لہ]

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اگر کسی مسئلے میں بریلوی حضرات نے "بالذات" اور "بالواسطہ" کی تفریق کو غلط استعمال کیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اب جو شخص بھی یہ اصطلاحات استعمال کرے گا وہ غلط ہی کرے گا، علامہ ابن تیمیہؒ پر تو کسی کے نزدیک بھی بریلویت کا سایہ نہیں پڑا، لیکن ملاحظہ فرمائیے، وہ لکھتے ہیں :۔

انما یجب علی الناس طاعۃ اللہ و رسولہ، وھٰؤلاء اولوا الامر الذین امر اللہ بطاعتھم ... انما تجب طاعتھم تبعاً لطاعۃ اللہ و رسولہ لا استقلالاً[لہ]

"انسان پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت واجب ہے، اور یہ اولوالامر (علماء یا حکام) جن کی اطاعت کا اللہ نے حکم دیا ہے ان کی طاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کی طاعت کے تابع ہو کر واجب ہے، مستقل بالذات ہو کر نہیں"

یہاں علامہ ابن تیمیہؒ خود "مستقل بالذات اطاعت" اور "بالواسطہ اطاعت" میں فرق کر رہے ہیں. کیا اس کو بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بریلوی حضرات جیسا فقرہ ہے؟ اور ملاحظہ فرمائیے! علامہ ابن تیمیہؒ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :۔

لہ تحریکِ آزادیٔ فکر، از حضرت مولانا محمد اسمٰعیل سلفیؒ، ص ۱۲۸ مکتبہ نذیریہ چیچاوطنی،
لہ فتاویٰ ابن تیمیہؒ، ج ۲ ص ۳۶۱،

فطاعة الله ورسوله وتحليل ما احله الله ورسوله وتحريم ما حرّمه الله ورسوله وايجاب ما اوجبه الله ورسوله واجب على جميع الثقلين الانس والجن واجب على كلّ احد فى كلّ حال سرًّا وعلانية، لكن لمّا كان من الاحكام ما لا يعرفه كثير من الناس رجع النّاس فى ذلك الى من يعلمهم ذلك لانه اعلم بما قال الرسول واعلم بمراده ؛ فأئمة المسلمين الذين اتبعوهم وسائل وطرق وادلة بين الناس وبين الرّسول يبلغونهم ما قاله ويفهمونهم مراده بحسب اجتهادهم واستطاعتهم، وقد يخص الله هذا العالم من العلم والفهم ما ليس عند الآخر[1]

"یہ بات تو جنّات اور انسانوں میں سے ہر ایک پر ہر حال میں سرًّا وعلناً واجب ہے کہ وہ اللہ اور اس کی رسولؐ ہی کی اطاعت کرے جس چیز کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا ہے اسے حلال قرار دے، جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام مانے، اور جو چیز اللہ اور اس کے رسولؐ نے واجب کی ہے اُسے واجب سمجھے، لیکن چونکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بہت سے احکام ایسے ہیں جنھیں بہت سے لوگ نہیں جانتے، اس لئے لوگ اس معاملے میں ایسے عالم کی طرف رجوع کرتے ہیں جو انھیں اللہ اور رسولؐ کے احکام بتا سکے، اس لئے کہ وہ

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیہؒ، ج ۲ ص ۲۳۹،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اُن کی صحیح مراد کو زیادہ جانتا ہے، لہٰذا مسلمان جن اماموں کی اتباع کرتے ہیں وہ درحقیقت لوگوں کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان وسیلے، راستے اور رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں جو مسلمانوں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پہنچائیں، اور انھیں اپنے اجتہاد اور استطاعت کے مطابق آپؐ کی مراد سمجھائیں، اور بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی خاص عالم کو ایسے علم اور فہم سے نوازتا ہے جو دوسرے کے پاس نہیں ہوتا۔"

غور فرمائیے کہ مقلد حضرات اس سے زائد اور کیا کہتے ہیں؟ کتاب کے شروع میں ہم نے تقلید کی جو حقیقت بیان کی ہے وہ اس سے سرمُو زیادہ نہیں،

واقعہ یہ ہے کہ "مستقل" اور "بالواسطہ" کی تفریق اس جگہ غلط ہوتی ہے جہاں اس تفریق کو محض ایک لفظی بہانہ کے طور پر اختیار کیا جائے، ورنہ "بالواسطہ" پر احکام سارے وہی عائد کئے جائیں جو "مستقل" اور "بالذات" کے احکام ہیں، اور مقلد حضرات کا عقیدہ اور عمل اس کے بالکل برخلاف ہے، یہ محض زبانی بات نہیں ہے کہ وہ ائمہ مجتہدین کو "بالذات" واجب الاطاعت نہیں سمجھتے، بلکہ پیچھے ہم تفصیل کے ساتھ عرض کرچکے ہیں کہ ان کے نزدیک :۔

(۱) دین کے بنیادی عقائد میں تقلید نہیں ہوتی،

(۲) جو احکام شریعت تواتر و بداہت سے ثابت ہیں اُن میں کسی کی تقلید نہیں کی جاتی،

(۳) قرآن وسنت کی جو نصوص قطعی الدلالۃ ہیں، اور جن کا کوئی معارض موجود نہیں ان میں کسی امام کی تقلید کی ضرورت نہیں،

(۴) تقلید صرف اس غرض کے لئے کی جاتی ہے کہ قرآن وسنت سے اگر مختلف باتوں کا اثبات ممکن ہو تو کسی ایک معنیٰ کو معین کرنے کے لئے اپنے ذہن

کے بجائے کسی مجتہد کی فہم پر اعتماد کیا جائے،

(۵) مجتہدینِ اُمت کسی کے نزدیک معصوم اور خطاؤں سے پاک نہیں ہیں؛ بلکہ اُن کے ہر اجتہاد میں غلطی کا امکان موجود ہے،

(۶) ایک متبحّر عالم اگر مجتہد کے کسی قول کو کسی صحیح اور صریح حدیث کے خلاف پائے، اور اس کا کوئی معارض موجود نہ ہو تو اس کے لئے ان شرائط کے ساتھ (جن کا ذکر "متبحّر عالم کی تقلید" کے عنوان کے تحت گزر چکا ہے) مجتہد کے قول کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرنا ضروری ہے،

اگر یہ طرزِ عمل بھی "شرک" ہے، اور اس پر بھی اپنے "علماء کو اپنا خدا بنانے" کی وعید چسپاں ہو سکتی ہے، تو پھر دنیا میں کونسا کام ایسے "شرک" سے خالی ہو سکتا ہے؟

جو حضرات تقلید کے مخالف ہیں، عملاً وہ خود بھی کسی نہ کسی مرحلے پر کسی نہ کسی حیثیت سے تقلید ضرور کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ غیر مقلّد حضرات میں سے ہر فرد ماں کے پیٹ سے مجتہد بن کر پیدا نہیں ہوتا، اور نہ ہر شخص عالم ہوتا ہے، اور اگر عالم بھی ہو تو ہر عالم کو ہر مسئلے میں ہر وقت کتاب وسنت کے پورے ذخیرے کی طرف رجوع کرنے کا موقع نہیں ہوتا، چنانچہ ان حضرات میں سے جو عالم نہیں ہوتے وہ علماء اہلِ حدیث سے مسئلہ پوچھ کر اُن کی تقلید کرتے ہیں، اسی مقصد کے لئے غیر مقلّد علماء کے فتاویٰ کے مجموعے شائع شدہ موجود ہیں، جن میں اوّل تو ہر جگہ دلیل بیان کرنے کا التزام نہیں، اور اگر ہو بھی تو ایک عام آدمی یہ کیسے فیصلہ کر سکتا ہے کہ جو دلیل انھوں نے بیان کی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟ لہٰذا وہ تو ان کے علم وفہم پر اعتماد کر کے ہی عمل کرتا ہے، اور اسی کا نام تقلید ہے،

رہے وہ حضرات جو باقاعدہ قرآن وسنّت کے عالم ہوتے ہیں وہ انصاف سے غور فرمائیں کہ کیا وہ ہر پیش آنے والے مسئلے میں تفسیر وحدیث کے تمام ذخیرے کھنگال کر کوئی مسئلہ مستنبط کرتے ہیں؟ اگر انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیا جا

تو اس سوال کا جواب کلیۃً نفی میں ہے، اس کے بجائے یہ حضرات بھی علماء متقدمین کی کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ یہ حضرات حنفی یا شافعی مسلک کی کتابوں کے بجائے علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن حزمؒ، علامہ ابن القیمؒ اور قاضی شوکانیؒ جیسے حضرات کی کتابیں دیکھتے ہیں، اور ہر مسئلے میں اُن کی بیان کی ہوئی تحقیق کو اپنی ذاتی تحقیق سے جانچنے کا موقع نہیں پاتے، بلکہ اس اعتماد پر ان کے اقوال اختیار کر لیتے ہیں کہ یہ حضرات قرآن وحدیث کے اچھے عالم ہیں، اور ان کے اقوال عموماً قرآن وسنّت سے معارض نہیں ہوتے۔

اور اگر بالفرض کسی خاص مسئلے میں ان حضرات کو قرآن وحدیث کے اصل ذخیرے کی تحقیق وتفتیش کا موقع مل بھی جائے تو کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دینے کے لئے ان کے پاس ذاتی تحقیق کا کوئی ذریعہ اس کے سوا نہیں ہے کہ ائمہ جرح وتعدیل کے اقوال کو تقلیداً اور صرف تقلیداً اختیار کریں، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ایک حدیث کو بعض اوقات ضعیف کہہ کر رَد فرما دیتے ہیں، اگر پوچھا جائے کہ اس حدیث کے ضعیف ہونے کی دلیل کیا ہے؟ تو اس کا جواب ان حضرات کے پاس بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ اسے فلاں محدّث نے ضعیف قرار دیا ہے، یا اس کے فلاں راوی پر فلاں امام نے جرح کی ہے، اور جرح وتعدیل کی کتابوں سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ان کتابوں میں ہمیشہ جرح وتعدیل کے تفصیلی دلائل مذکور نہیں ہوتے، بلکہ بالآخر ائمۂ فن کی تحقیق پر ہی اعتماد کرنا ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایک صحیح حدیث کے مقابل دوسری حدیث بھی صحیح سند سے مروی ہوتی ہے، لیکن یہ حضرات دوسری حدیث کو محض اس بناء پر رَد کر دیتے ہیں کہ فلاں محدّث نے اسے مرجوح یا معلول قرار دیا ہے، یہ سارا طرزِ عمل تقلید نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر کوئی شخص اس پر ... "اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ" کی آیت چسپاں کرنے لگے تو غیر مقلّد حضرات کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ ان ائمۂ فن کی

اطاعت اُن کو مستقلاً واجب الاطاعت سمجھ کر نہیں کی جارہی، بلکہ ماہرِ فن کی حیثیت سے اُن کی تحقیق پر اعتماد کرکے کی جارہی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ماہرینِ فن کی تقلید سے زندگی کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے اور اگر اس کو مطلقاً شجرِ ممنوعہ قرار دیدیا جائے تو دین و دنیا کا کوئی کام نہیں چل سکتا،

حضرت عدی بن حاتمؓ کی حدیث

(۳) تقلید کی مخالفت میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی مذکورہ ذیل حدیث بھی بہ کثرت پیش کی جاتی ہے:۔

عن عدی بن حاتم قال اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم و فی عنقی صلیب من ذھب فقال یا عدیؓ! اطرح عنک ھذا الوثن، وسمعتہ یقرأ فی سورۃ براءۃ:
اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ
قال اما انھم لم یکونوا یعبدونھم ولکنھم کانوا اذا احلّوا لھم شیئاً استحلّوا واذا حرّموا علیھم شیئاً حرّموہ (رواہ الترمذیؒ)

حضرت عدی بن حاتمؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، میری گردن میں سونے کی صلیب تھی، آپؐ نے فرمایا: اے عدی! اس بُت کو اُتار پھینکو اور میں نے آپؐ کو سورۂ برأت کی یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سُنا کہ اتخذوا احبارھم ورھبانھم الخ (ان اہلِ کتاب نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے بجائے اپنا پروردگار بنالیا ہے) چنانچہ (اس آیت کی تفسیر میں) آپؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ اپنے علماء اور راہبوں کی پرستش نہیں کرتے تھے، لیکن جب اُن کے علماء

اور راہب اُن کے لئے کوئی چیز حلال کرتے تو یہ اُسے حلال قرار دیتے اور جب وہ اُن پر کوئی چیز حرام کرتے تو یہ اس کو حرام قرار دیتے تھے۔"

لیکن اس حدیث سے بھی ائمۂ مجتہدین کی تقلید کا کوئی تعلق نہیں ہے، اور فرق کی وجوہ وہی ہیں جو پچھلے اعتراضات میں بیان کی جا چکی ہیں، یہاں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ جن اہل کتاب کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ انھوں نے حلال و حرام کرنے کا اختیار اپنے علماء اور راہبوں کو دے رکھا تھا، وہ اپنے پاپاؤں کو واقعۃً شارح قانون نہیں بلکہ شارع اور معصوم عن الخطاء سمجھتے تھے، اور تحریم و تحلیل کا مکمل اقتدار و اختیار انھوں نے اپنے پاپاؤں کو دے رکھا تھا، چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں "پوپ" کے اختیارات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"لہٰذا پوپ عقائد کے معاملے میں مقتدر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اسی حجیت (AUTHORITY) اور اسی معصومیت (INFALLIBILITY) کا حامل ہے جو پورے کلیسا کو مجموعی طور سے حاصل ہے، چنانچہ پوپ واضع قانون ..... (LEGISLATOR) اور قاضی کی حیثیت میں وہ تمام اختیارات رکھتا ہے جو کلیساؤں کی اجتماعی کونسل کو حاصل ہیں، چنانچہ پوپ کے اقتدار اعلیٰ کے دو لازمی حقوق ہیں، ایک عقائد وغیرہ کے معاملے میں معصوم عن الخطاء ہونا اور دوسرے تمام اہل عقیدہ پر ہر پہلو سے مکمل قانونی اختیار"[1]

اور اسی کتاب میں دوسری جگہ پوپ کی معصومیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:-

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ج ۱۸، ص ۲۲۲ و ۲۲۳ مطبوعہ ۱۹۵۰ء مقالہ "پوپ"۔

"رومن کیتھولک چرچ پوپ کی جس معصومیت کا قائل ہے اس کا
بنیادی مفہوم یہ ہے کہ جب پوپ تمام اہل عقیدہ پر نافذ ہونیوالا
کوئی ایسا فرمان جاری کرے جو عقائد یا اخلاقیات سے متعلق ہو
تو وہ غلطی نہیں کرسکتا"[1]

ملاحظہ فرمائیے کہ عیسائیوں نے اپنے پاپاؤں کو جو اختیارات دے رکھے تھے (اور اب بھی دے رکھے ہیں) اُن کو ائمۂ مجتہدین کی تقلید سے کیا نسبت ہے؟ برٹانیکا کی مذکورہ عبارت کے مطابق:۔

(۱) "پوپ" عیسائیوں کے نزدیک مستقل "حجت" ہے، جبکہ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں "تقلید" کی تعریف کرتے ہوئے یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ "مجتہد" کے قول کا حجتِ شرعیہ نہ ہونا خود تقلید کی تعریف میں داخل ہے،

(۲) "پوپ" کو عقائد کے معاملے میں بھی ایسا فرمان جاری کرنے کا مکمل اختیار ہے جو تمام اہل عقیدہ پر نافذ ہو، اور پیچھے بیان کیا جاچکا ہے کہ ائمۂ مجتہدین کے مقلد حضرات عقائد میں تقلید کے قائل نہیں،

(۳) عیسائی مذہب میں پوپ کو "واضع قانون" یعنی شارع قرار دیا گیا ہے، حالانکہ ائمۂ مجتہدین کو ان کا کوئی مقلد شارع یا واضع قانون نہیں مانتا، بلکہ محض شارحِ قانون سمجھتا ہے، جس کی تفصیل پچھلے اعتراض کے جواب میں آچکی ہے،

(۴) عیسائی مذہب میں "پوپ" کو معصوم عن الخطاء قرار دیا جاتا ہے، اور ائمۂ مجتہدین کے بارے میں تمام مقلدین کا عقیدہ یہ ہے کہ اُن کے ہر اجتہاد میں خطاء کا احتمال ہے،

(۵) عیسائی مذہب میں "پوپ" کو تمام اہل عقیدہ پر ہر پہلو سے مکمل قانونی اختیار ہوتا ہے، اور کسی بھی اہل عقیدہ کو اس کے کسی حکم سے سرِمو انحراف کی اجازت نہیں، اس کے برعکس ائمۂ مجتہدین کے مقلد حضرات کو بعض حالات

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ج ۱۲ ص ۳۱۸ مقالہ "معصومیت" (INFALLIBILITY)

میں اپنے مجتہد کے قول کو چھوڑ دینے کا اختیار ہے، جس کی تفصیل "تقلید کے مختلف درجات" کے عنوان کے تحت بیان ہو چکی ہے،

زمین و آسمان کے اس عظیم فرق کی موجودگی میں حضرت عدی بن حاتمؓ کی حدیث کو ائمۂ مجتہدین کے مقلدوں پر کیسے چسپاں کیا جا سکتا ہے؟ ہاں! البتہ اگر کوئی شخص تقلیدِ جامد کی اُس حد پر پہنچ جائے جس پر نصاریٰ پہنچے تھے، اور ائمۂ مجتہدین کے بارے میں وہی عقائد رکھے جو اوپر عیسائیوں کے بیان کئے گئے ہیں، تو بلاشبہ وہ اس حدیث کی وعید میں داخل ہوگا،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک ارشاد

(۴) تقلید کے خلاف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک ارشاد بھی عموماً پیش کیا جاتا ہے:-

لا یقلدن رجل رجلاً دینه ان آمن آمن وان کفر کفر،

"کوئی شخص اپنے دین میں کسی دوسرے شخص کی اس طرح تقلید نہ کرے کہ اگر وہ ایمان لائے تو یہ بھی ایمان لائے، اور اگر وہ کفر کرے تو یہ بھی کفر کرے"

لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی تقلید کو کون جائز کہتا ہے؟ حضرت ابن مسعودؓ کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وہ ایمانیات میں کسی کی تقلید کو جائز قرار نہیں دے رہے، اور یہ ہم بار بار عرض کر چکے ہیں کہ ایمانیات میں تقلید ہمارے نزدیک بھی درست نہیں، ورنہ جہاں تک احکامِ شریعت معلوم کرنے کے لئے اسلاف کی تقلید کا تعلق ہے، اس کے بارے میں خود حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کا یہ ارشاد ہے کہ:-

من کان مستناً فلیستن بمن قد مات، فان الحی لا تؤمن علیه الفتنة اولئك اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم کانوا افضل هذه الامة ... فاعرفوا لهم فضلهم

واتبعوھم علی اثرھم وتمسکوا بما استطعتم من اخلاقھم وسیرھم فانھم کانوا علی الھدی المستقیم[1]

"جس شخص کو کسی کی اتباع کرنی ہو وہ ان حضرات کی اتباع کرے جو وفات پاچکے، کیونکہ جو زندہ ہیں اُن پر یہ اطمینان نہیں کہ وہ کبھی فتنے میں مبتلا نہیں ہوں گے، وہ (قابلِ اتباع) حضرات صحابہ ہیں جو اس اُمّت کے افضل ترین افراد ہیں ...... پس تم ان کی قدر پہچانو، اور اُن کے آثار کی اتباع کرو، اور ان کے اخلاق اور سیرتوں کو جتنا ہوسکے تھام لو، کیونکہ وہ صراطِ مستقیم پر تھے۔"

ائمہ مجتہدینؒ کے ارشادات

(۵) بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ ائمہ مجتہدین نے خود یہ فرمایا ہے کہ ہمارے قول پر اس وقت تک عمل نہ کرو جب تک اس کی دلیل معلوم نہ ہوجائے، نیز یہ کہ اگر ہمارا قول حدیث کے خلاف ہو تو اسے دیوار پر دے مارو، اور حدیث پر عمل کرو،

لیکن اگر انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو درحقیقت ائمہ مجتہدین کے ان ارشادات کے مخاطب وہ لوگ نہیں ہیں جو اجتہاد کی صلاحیت سے محروم ہیں، بلکہ وہ حضرات ہیں جن میں اجتہاد کی شرائط موجود ہوں، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایسے اقوال کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

انما یتم فیمن لہ ضرب من الاجتھاد ولو فی مسئلۃ واحدۃ وفیمن ظھر علیہ ظھورا بینًا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امر بکذا او نھی عن کذا وانہ لیس بمنسوخ إما بأن یتتبع الاحادیث واقوال المخالف والموافق فی المسئلۃ او بان یری جمًّا غفیرا من المتبحرین فی العلم

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، ص ۳۲ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ،

یذھبون الیہ ویری المخالف لہ لایحتج الا بقیاس او استنباط او نحو ذلک فحینئذ لا سبب لمخالفۃ حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا نفاق خفی او حمق جلی [۱]"

"یہ اقوال اُس شخص کے حق میں صادق آتے ہیں جسے ایک قسم کا اجتہاد حاصل ہو، خواہ ایک ہی مسئلہ میں ہو، اور جس پر یہ بات کھلے طور سے واضح ہوگئی ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں بات کا حکم دیا ہے یا فلاں بات سے روکا ہے، اور یہ بات بھی اس پر واضح ہوگئی ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منسوخ نہیں ہے، یا تو اس طرح کہ وہ تمام احادیث کی تحقیق اور مسئلے سے متعلق مخالفین و موافقین کے اقوال کا تتبع کرکے اس نتیجے پر پہنچا ہو کہ نسخ کی کوئی دلیل نہیں ہے، یا اس نے متبحر علماء کے جم غفیر کو دیکھا ہو کہ وہ اس پر عمل کر رہے ہیں، اور اس پر یہ بات ثابت ہوگئی ہو کہ جس امام نے اس حدیث کی مخالفت کی ہے اس کے پاس سوائے قیاس اور استنباط وغیرہ کے کوئی دلیل نہیں ہے، ایسی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی مخالفت کا سوائے پوشیدہ نفاق یا کھلم کھلا حماقت کے کوئی سبب نہیں ہو سکتا"

اور یہ بات اس قدر واضح ہے کہ اس پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، ورنہ ائمۂ مجتہدین کے اقوال کا مطلب اگر یہ ہوتا کہ تقلید کسی کے لئے جائز نہیں ہے تو ان کی زندگی ایسے واقعات سے بھرپور رہی کہ لوگ اُن سے مسائل پوچھتے تھے، اور وہ دلیل بیان کئے بغیر جواب دیدیتے تھے، اگر یہ چیز اُن کے نزدیک جائز نہ ہوتی

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۵، باب حکایۃ حال الناس قبل المأۃ الرابعۃ وبعدہا،

تو وہ خود اس کا سبب کیوں بنتے؟ اس کے علاوہ خود اُن کے متعدد اقوال ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مجتہد کے لئے تقلید کو ضروری قرار دیتے ہیں، مثلاً چند اقوال ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) کفایہ شرح ہدایہ میں ہے:۔

واذا کان المفتی علی هذه الصفة فعلی العامی تقلیده، وان کان المفتی اخطأ فی ذلك، ولا معتبر بغیره، هکذا روی الحسن عن ابی حنیفةؒ وابن رستمؒ عن محمدؒ وبشیر بن الولیدؒ عن ابی یوسفؒ،[1]

"اور جب مفتی اس صفت کا (یعنی مجتہد) ہو تو عامی آدمی پر اس کی تقلید کرنی ضروری ہے، خواہ مفتی سے خطا ہو جائے، اس کے سوا کا اعتبار نہیں، امام حسنؒ نے امام ابو حنیفہؒ کا، ابن رستمؒ نے امام محمدؒ کا اور بشیر بن الولیدؒ نے امام ابو یوسفؒ کا یہی قول روایت کیا ہے"

(۲) امام ابو یوسفؒ کا یہ قول پیچھے گذر چکا ہے کہ:۔

علی العامی الاقتداء بالفقهاء لعدم الاهتداء فی حقه الی معرفة الاحادیث[2]

(۳) امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں علامہ ابن تیمیہؒ نقل فرماتے ہیں:۔

ویأمر العامی بأن یستفتی اسحٰقؒ وابا عبیدؒ وابا ثورؒ وابا مصعبؒ وینهی العلماء من اصحابه کابی داؤد وعثمان بن سعید وابراهیم الحربی وابی بکر الاثرم وابی زرعة وابی حاتم السجستانی ومسلم وغیرهؤلاء

[1] کفایہ شرح ہدایہ کتاب الصوم، ماخوذ از خیر التنقید مؤلفہ حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ،

[2] ہدایہ ج ۱ ص ۲۲۶ باب مایوجب القضاء والکفارة،

ان یقلدوا احدا من العلماء ویقول علیکم بالاصل بالکتاب والسنۃ،[1]

"امام احمدؒ عام لوگوں کو امام اسحٰقؒ، امام ابو عبیدؒ، امام ابو ثورؒ اور امام ابو مصعبؒ سے مسائل دریافت کرنے کا حکم دیتے تھے، اور اپنے اصحاب میں سے جو علماء تھے، مثلاً امام ابو داؤد، عثمان بن سعیدؒ ابراہیم الحربیؒ، ابو بکر الاثرمؒ، ابو زرعہؒ، ابو حاتم سجستانیؒ اور امام مسلمؒ وغیرہ ان کو کسی کی تقلید کرنے سے روکتے تھے اور ان سے فرماتے تھے کہ تم پر اصل کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا واجب ہے"

علامہ ابن تیمیہؒ کی اس عبارت نے بالکل واضح کردیا کہ جن مجتہدین نے تقلید سے منع کیا ہے وہ اپنے اُن شاگردوں کو منع کیا ہے جو بذاتِ خود جلیل القدر محدثین اور ماہر فقہاء تھے، اور اجتہاد کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، غیر مجتہد افراد کو انھوں نے نہ صرف یہ کہ منع نہیں فرمایا بلکہ خود مجتہدین سے استفتاء کرکے اُن کی تقلید کا حکم دیا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غیر مجتہد افراد کے لئے تقلید کا جواز بلکہ وجوب ایسا متفق اور مفروغ عنہ مسئلہ تھا کہ سوائے معتزلہ کے کسی سے اس میں اختلاف منقول نہیں چنانچہ علامہ سیف الدین آمدیؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

العامی ومن لیس لہ اھلیۃ الاجتھاد وان کان محصلاً لبعض العلوم المعتبرۃ فی الاجتھاد یلزمہ اتباع قول المجتھدین والاخذ بفتواہ عند المحققین من الاصولیین ومنع من ذلک بعض معتزلۃ البغدادیین[2]

---

[1] فتاوی ابن تیمیہؒ ج ۲ ص ۲۴۰ ؛ [2] احکام الاحکام، للآمدیؒ ج ۴ ص ۱۹۷ قاعدہ نمبر ۳ باب نمبر ۲ مسئلہ نمبر ۲، مزید ملاحظہ فرمائیے المستصفیٰ للامام الغزالیؒ ج ۲ ص ۱۲۴ فن نمبر ۲ قطب نمبر ۴،

عام آدمی اور جس شخص نے بعض علوم معتبرہ فی الاجتہاد حاصل کر رکھے ہوں، لیکن اس میں اجتہاد کی اہلیت نہ ہو اس پر مجتہدین کے اقوال کی اتباع اور ان کے فتوی پر عمل کرنا واجب ہے محقق اصولیین کا یہی مسلک ہے، البتہ بعض بغدادی معتزلہ نے اس سے منع کیا ہے"

اور علامہ خطیب بغدادیؒ غیر مجتہد عامی پر تقلید کا وجوب بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

وحکی عن بعض المعتزلۃ انہ قال لا یجوز للعامی العمل بقول العالم حتی یعرف علۃ الحکم... وھذا غلط لانہ لا سبیل للعامیّ الی الوقوف علی ذلک الا بعد ان یتفقہ سنین کثیرۃ ویخالط الفقہاء المدۃ الطویلۃ ویتحقق طرق القیاس ویعلم ما یصححہ ویفسدہ وما یجب تقدیمہ علی غیرہ من الادلۃ وفی تکلیف العامۃ بذلک تکلیف ما لا یطیقونہ ولا سبیل لھم الیہ[1]،

"بعض معتزلہ سے منقول ہے کہ ان کے نزدیک عامی کے لئے بھی عالم کے قول پر اُس وقت تک عمل جائز نہیں جب تک اُسے حکم کی علّت کا علم نہ ہو جائے، ... اور یہ مسلک بالکل غلط ہے، اس لئے کہ عامی کے پاس حکم کی علّت معلوم کرنے کی اس کے سوا کوئی سبیل نہیں کہ وہ سالہا سال فقہ کی تعلیم حاصل کرے، طویل مدّت تک فقہاء کی صحبت میں رہے، قیاس کے طریقوں کی پوری تحقیق کرے اور اس بات کا علم حاصل کرے کہ کونسا قیاس صحیح اور کونسا فاسد ہوتا ہے؟ اور کس دلیل کو دوسری دلیل پر

---

[1] الفقیہ والمتفقہ، للخطیب البغدادیؒ ج ۲ ص ۶۹، مطبوعہ دار الافتاء ریاض،

مقدم رکھنا چاہتے؟ اور تمام لوگوں کو اس محنت کا مکلف کرنا تکلیف مالایطاق ہے جس کی ان میں قدرت نہیں"

ہاں اگر مجتہدین میں اختلاف ہوا ہے تو اس میں ہوا ہے کہ جس شخص کو اجتہاد کے اوصاف حاصل ہوں وہ بھی کسی کی تقلید کر سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ خطیب بغدادیؒ نے حضرت سفیان ثوریؒ کا مسلک یہ نقل کیا ہے کہ وہ بھی تقلید کر سکتا ہے، اور امام محمدؒ کا مسلک یہ بتایا ہے کہ اپنے سے اعلم کی تقلید کر سکتا ہے[1] اور علامہ ابن تیمیہؒ نے امام محمدؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اُن کے نزدیک بھی حضرت سفیان ثوریؒ کی طرح مجتہد کے لئے مطلقاً تقلید جائز ہے، اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک مطلقاً ناجائز ہے[2]، اور حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ صاحب نے شمس الائمہ حلوانیؒ کے ترجمے میں امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:۔

وقد روی عن الامام الاعظمؒ جواز التقلید لمجتھد بمن ھو اعلم منہ[3]

"امام اعظمؒ سے مروی ہے کہ مجتہد کے لئے اپنے سے بڑے عالم کی تقلید جائز ہے"

اس اختلاف کی پوری تفصیل اصولِ فقہ کی بیشتر کتابوں میں موجود ہے[4]، غرض ائمہ مجتہدین کا اس میں تو اختلاف رہا ہے کہ جو شخص خود مجتہد ہو وہ کسی دوسرے مجتہد کی تقلید کر سکتا ہے یا نہیں؟ لیکن اس مسئلے میں بعض معتزلہ کے سوا کسی کا اختلاف نہیں کہ غیر مجتہد کے لئے تقلید ناگزیر ہے،

---

[1] الفقیہ والمتفقہ، للخطیب البغدادیؒ ج ۲ ص ۶۹ مطبوعہ دارالافتاء، ریاض،
[2] فتاوی ابن تیمیہ ج ۲ ص ۲۴۰، [3] التعلیقات السنیہ علی تراجم الحنفیۃ ص ۹۶، ماخوذ از خیر التنقید، ص ۴۶ [4] مثلاً ملاحظہ ہو فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، ص ۲۲۰ والمستصفی للغزالیؒ ج ۲ ص ۱۲۱ فن نمبر ۱ قطب نمبر ۴،

عام آدمی مجتہد کو کیسے پہچانے

(۶) ہم نے کتاب کے شروع میں لکھا ہے کہ "تقلید کی دونوں قسموں کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک شخص براہِ راست قرآن وسنّت سے مسائل مستنبط کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو وہ جسے قرآن وسنت کا ماہر سمجھتا ہے اس کے فہم وبصیرت اور تفقہ پر اعتماد اور اس کی تشریحات پر عمل کرتا ہے۔"

اس پر بعض حضرات کو یہ اعتراض ہے کہ: "اگر مستفید جاہل ہے تو وہ امام یا مسئول کی مہارت کیسے معلوم کرے گا؟ اگر مہارتِ علمی کا جائزہ لے سکتا ہے تو وہ اس کے فقہ پر کیوں اعتماد کرے؟"[1]

اس اعتراض کے جواب میں ہم امام غزالی رحؒ کی ایک عبارت نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:-

فان قيل ... العامی يحكم بالوهم ويغتر بالظواهر وربما يقدم المفضول على الفاضل، فان جاز ان يحكم بغير بصيرة فلينظر فی نفس المسئلة وليحكم بما يظنه، فلمعرفة مراتب الفضل ادلة غامضة ليس دركها من شأن العوام؟ وهذا السؤال واقع، ولكنا نقول: من مرض له طفل وهو ليس بطبيب فسقاه دواء برأيه كان متعدیاً مقصراً ضامناً، ولو راجع طبيباً لم يكن مقصراً، فان كان فی البلد طبيبان فاختلفا فی الدواء فخالف الافضل عُدّ مقصراً، ويعلم فضل الطبيبين بتواتر الاخبار وباذعان المفضول له وبتقديمه بامارات تفيد غلبة الظن فكذلك فی حق العلماء، يعلم الافضل بالتسامع

---

[1] تحریکِ آزادیٔ فکر از مولانا سلفی رحؒ، ص۱۳۰۔

وبالقرائن دون البحث عن نفس العلم، والعامی اهل له فلا ینبغی ان یخالف الظن بالتشهی، فهذا هو الاصح عندنا والألیق بالمعنی الکلی فی ضبط الخلق وبلجام التقوی والتکلیف[1]،

" اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ عامی تو اوہام پر فیصلے کرتا ہے، اور سطحیات سے دھوکہ میں پڑجاتا ہے، اور بعض اوقات مفضول کو افضل سے مقدم سمجھنے لگتا ہے، لہٰذا اگر (کسی مجتہد کو قابلِ تقلید قرار دینے میں) وہ پوری بصیرت کے بغیر فیصلہ کرسکتا ہے تو اصل مسئلے ہی میں کیوں اپنے ظن وگمان کے مطابق فیصلہ نہ کرے؟ اس لئے کہ علم و فضل کے حقیقی مراتب پہچاننے کے لئے تو بڑے غامض دلائل کی ضرورت ہوتی ہے، جن کا ادراک عوام کا کام نہیں؟ ——

یہ سوال پیدا تو ہوتا ہے، لیکن ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ جس شخص کا بچہ بیمار ہو اور وہ خود طبیب نہ ہو تو اگر وہ بچے کو کوئی دوا اپنی رائے سے پلائے تو اس کو بلا شبہ ظالم، کوتاہی کرنے والا اور اس کے نتائج کا ذمہ دار کہا جائے گا، لیکن اگر کسی طبیب سے رجوع کرلے تو اس پر کسی کوتاہی کا الزام نہ ہوگا، پھر اگر شہر میں دو طبیب ہوں، اور دونوں کا دوا تجویز کرنے میں اختلاف ہوجائے تو اس شخص پر کوتاہی کا الزام اُس وقت آئے گا جب اس نے دونوں طبیبوں میں سے بہتر طبیب کی مخالفت کی ہو، اور ایک عام آدمی طبیبوں کی مہارت کا علم متواتر خبروں سے حاصل کرتا ہے، یا اس طرح اندازہ لگاتا ہے کہ کم علم طبیب اُس کی بات مانتے اور اُسے مقدم قرار

---

[1] المستصفی، للامام الغزالیؒ ج ۲ ص ۱۲۶ مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ قبیل الفن الثالث من القطب الرابع

دیتے ہوں، اسی طرح اور بہت سے علامتیں ہوتی ہیں جن سے ایک عام آدمی بھی کسی طبیب کے ماہر ہونے کا گمانِ غالب قائم کر لیتا ہے، پس یہی معاملہ علماء کے ساتھ ہونا چاہیے کہ اُن میں سے کسی عالم کے افضل ہونے کا فیصلہ عام شہرت اور اسی قسم کے دوسرے قرائن سے کیا جاتا ہے، اور اس کے لئے اُس علم کی پوری تحقیق ضروری نہیں ہوتی، اور عام آدمی اس فیصلے کا اہل ہے، لہٰذا وہ جس عالم کو یہ گمانِ غالب افضل پائے اس کے لئے اپنی خواہشاتِ نفسانی کی بنیاد پر اس کی مخالفت درست نہیں، یہی طریقہ ہمارے نزدیک درست تر ہے، اور مخلوقِ خدا کو قابو میں رکھنے اور اُن کو تقویٰ اور احکامِ شرعیہ کا پابند کرنے کے لئے زیادہ مناسب ہے۔"

کیا تقلید کوئی عیب ہے؟

(۷) ہم نے کتاب کے شروع میں مختلف روایات کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ تقلید کا رواج عہدِ صحابہؓ میں بھی تھا، اور جو صحابہؓ بذاتِ خود اجتہاد نہ فرما سکتے تھے، وہ فقہاءِ صحابہؓ سے رجوع فرماتے تھے، اس پر بعض حضرات نے یہ اعتراض فرمایا ہے کہ "تقلید" تو ایک عیب ہے جو کم علمی سے پیدا ہوتا ہے، لہٰذا صحابۂ کرامؓ میں تقلید ثابت کرنا (معاذ اللہ) اُن پر ایک عیب لگانا ہے، اور "یہ کونسا مقدس تحفہ ہے جسے آپ صحابہؓ کے لئے ثابت فرما رہے ہیں؟" نیز یہ کہ "صحابہؓ تمام جس طرح عدول تھے اسی طرح وہ سب فقہاء بھی تھے" اور "صحابہؓ میں فقیہ اور غیر فقیہ کی تفریق شرمناک ہے"[1]

لیکن یہ اعتراض درحقیقت محض جذباتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ کسی شخص کا فقیہ یا مجتہد نہ ہونا کوئی عیب نہیں ہے، اور نہ آدمی کی بڑائی اور افضلیت کے لئے اس کا فقیہ اور مجتہد ہونا ضروری ہے، قرآن کریم نے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ فرمایا ہے، اعلمکم یا افقھکم نہیں فرمایا، یعنی کسی شخص کے زیادہ قابلِ اکرام

---

[1] تحریکِ آزادیٔ فکر، ص ۱۳۳ تا ۱۳۵۔

واحترام ہونے کا اصل معیار تقویٰ ہے، محض علم و تفقہ نہیں، لہذا اگر ایک شخص تقویٰ کی شرائط پر کھرا ثابت ہوتا ہے تو اس میں دینی اعتبار سے ثمہ برابر کوئی عیب نہیں ہے، خواہ اُس میں فقہ و اجتہاد کی ایک شرط بھی نہ پائی جاتی ہو،

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ صحابۂ کرامؓ تقویٰ کے اس مقام پر — جو دینی فضیلت کا حقیقی مقام ہے — سب کے سب بلا استثناء فائز ہیں، اور اسی لئے اُن کو بالکل بجا طور پر خیر الخلائق بعد الانبیاء (انبیاء کے بعد تمام مخلوقات میں افضل ترین) قرار دیا گیا ہے، لیکن جہاں تک علم و فقہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ "صحابہؓ سب کے سب فقہاء تھے" قرآن و حدیث کے بالکل خلاف ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝ (التوبہ: ۱۲۳)

"پس کیوں نہ نکل پڑا ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ تاکہ یہ لوگ دین میں تفقہ حاصل کریں، اور تاکہ لوٹنے کے بعد اپنی قوم کو ہوشیار کریں، شاید کہ وہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے) بچیں"

اس آیت میں صحابۂ کرامؓ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اُن کی ایک جماعت جہاد میں مشغول ہو، اور دوسری جماعت تفقہ حاصل کرنے میں، یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بعض صحابہؓ خود اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تفقہ حاصل کرنے کے بجائے جہاد اور دوسری اسلامی خدمات میں مصروف ہوئے، لہذا صحابۂ کرامؓ میں فقیہ اور غیر فقیہ کی تفریق" تو خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے، اور منشائے خداوندی کے عین مطابق ہے، اس کو عیب سمجھنے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہئے،

اسی طرح پیچھے سورۂ نساء کی آیت لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ کی تفسیر گزر چکی ہے، جس سے صاف واضح ہے کہ صحابۂ کرامؓ میں سے کچھ حضرات کو

قرآن کریم نے اہل استنباط قرار دیا، اور کچھ تو یہ حکم دیا کہ ایسے معاملات میں اُن اہل استنباط کی طرف رجوع کریں، لہٰذا صحابۂ کرامؓ میں اہل استنباط اور غیر اہل استنباط کی تفریق بھی خود قرآن کریم نے فرمائی ہے،

نیز سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مشہور و معروف ہے کہ :-

نَضَّرَ اللّٰہُ عَبْدًا سمع مقالتی فحفظہا ووعاہا واداہا فرب حامل فقہ غیر فقیہ، ورب حامل فقہ الی من ہو أفقہ منہ[1]،

"اللہ تعالیٰ اس بندے کو شاداب کرے جس نے میری بات سُنی، اُسے یاد کیا، اور محفوظ رکھا اور دوسروں تک اُس کو پہنچایا اس لئے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ کسی فقہ کی بات کو اُٹھائے ہوئے ہوتے ہیں مگر خود فقیہ نہیں ہوتے، اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو فقہ کی بات اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنے سے زیادہ فقیہ تک اُس کو پہنچا دیتے ہیں"

اس ارشاد کے بلا واسطہ مخاطب صحابۂ کرامؓ ہی ہیں، اور اس ارشاد نے دو باتیں واضح فرما دیں، ایک تو یہ کہ ایسا ممکن ہے کہ کوئی راوئ حدیث فقیہ نہ ہو، دوسرے یہ کہ یہ فقیہ نہ ہونا اس کے حق میں (معاذ اللہ) کوئی عیب نہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شادابی کی دُعاء دی ہے،

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی نعمت بے بہا سے مختلف قسم کے حضرات سرفراز ہوئے ہیں، ان میں حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ جیسے حضرات بھی تھے، اور حضرت اقرع ابن حابسؓ اور حضرت سلمہ بن صخرہ رضی اللہ عنہم جیسے پاک نفس اور سادہ لوح اعراب بھی تھے، جہاں تک ان سادہ لوح اعرابی صحابہؓ

---

[1] رواہ احمد والترمذی وابو داؤد وابن ماجۃ والدارمی عن زید بن ثابتؓ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۵ ج ۱ کتاب العلم، فصل ۲،

کے شرفِ صحابیت، تقویٰ و طہارت اور فضیلت کا تعلق ہے، اس اعتبار سے بلاشبہ ان پر بعد کے ہزار اہلِ علم و فضل قربان ہیں، اور کوئی کتنا بڑا مجتہد ہو جائے، اُن کے مقامِ بلند کو چھُو بھی نہیں سکتا، لیکن جہاں تک ان حضرات کو علم و فقہ کے اعتبار سے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ، حضرت علیؓ و ابن مسعودؓ اور دوسرے فقہاءِ صحابہؓ کی صف میں شمار کرنے کا تعلق ہے یہ کھلی ہوئی بداہت کا انکار ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابۂ کرام میں سے جن حضرات کے فتاویٰ امت میں محفوظ رہے ہیں، ان کی تعداد علامہ ابن قیمؒ کے بیان کے مطابق کُل ایک سو تیس سے کچھ اوپر ہے۔[1]

اور یہ خیال تو بالکل غلط اور صحابۂ کرامؓ کے مزاج سے انتہائی بعید ہے، کہ ان حضرات کا کسی کی تقلید کرنا یا کسی سے استفتاء کرنا (معاذ اللہ) اُن کی شان میں کسی طرح کا عیب ہے، یہ تو وہ حضرات ہیں جنھوں نے دین کے معاملہ میں کسی سے استفادہ کو ادنیٰ عیب نہیں سمجھا، فقہاءِ صحابہؓ کی تقلید کی مثالیں تو پیچھے گزر ہی چکی ہیں، صحابۂ کرامؓ کی بے نفسی اور خدا ترسی کا عالم تو یہ تھا کہ ان میں سے بعض حضرات تو تابعین سے علم حاصل کرنے اور ان سے مسائل پوچھنے میں ادنیٰ تأمل نہیں کرتے تھے مثلاً حضرت علقمہ بن قیس نخعیؒ حضرت ابن مسعودؓ کے شاگرد ہیں، اور خود تابعی ہیں لیکن بہت سے صحابہؓ علم و فقہ کے معاملات میں اُن کی طرف رجوع فرماتے تھے۔[2]

لہٰذا صحابۂ کرامؓ کے عہد میں تقلید کی جو مثالیں اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں اُن کو اس بناء پر ماننے میں.... تأمل کرنا کوئی صحیح طرزِ عمل نہیں کہ ان کو تسلیم کرنے سے (معاذ اللہ) صحابۂ کرامؓ کی شان میں کوئی عیب لازم آجائے گا۔[3]

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۹ [2] تذکرۃ الحفاظ للذہبیؒ و حلیۃ الاولیاء لابی نعیمؒ،

[3] واضح رہے کہ یہاں ہماری اس بحث کا مقصد صرف یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ میں فقہاء اور (غیر فقہاء) کی تفریق چنداں قابلِ اعتراض نہیں، رہا قاضی عیسیٰ بن ابان وغیرہ کا یہ اصول کہ غیر فقیہ صحابی کی روایت اگر خلافِ قیاس ہو تو وہ قبول نہیں، سو محقق علماء نے اس اصول کی شدت کے ساتھ تردید کی ہے۔ لیکن یہ بالکل دوسری بحث ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ۱۲

تقلیدِ شخصی اور خواہش پرستی

(۸) "تقلیدِ شخصی کی ضرورت" کے عنوان کے تحت پیچھے لکھا جاچکا ہے کہ اصل میں "تقلیدِ مطلق" اور "تقلیدِ شخصی" دونوں جائز ہیں، لیکن بعد کے علماء نے جب یہ دیکھا کہ لوگوں میں دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے، اور "تقلیدِ مطلق" سے خواہش پرستی کا دروازہ کھل سکتا ہے تو انھوں نے یہ فتویٰ دیا کہ اب لوگوں کو صرف تقلیدِ شخصی پر عمل کرنا چاہئے،

اس پر بعض حضرات نے یہ عجیب وغریب اعتراض فرمایا ہے کہ :-

> "پاکستان میں اکثریت حضرات احناف کی ہے ... اور جتنے رقص وسرود کے کلب موجود ہیں ان کے منتظم حنفی حضرات ہیں، اگر تقلیدِ شخصی ہَوا پرستیوں کا علاج ہے تو آج ہَوا پرستیوں کے یہ معمل جابجا کیوں موجود ہیں ؟"[۵۱]

اس کے جواب میں ادب کے ساتھ گذارش ہے کہ جس شخص نے خدا رسول کے احکام کی کھلم کھلا نافرمانی پر کمر باندھ لی ہو، اور گناہ کو گناہ سمجھنے کے باوجود اس کے ارتکاب پر مُصر ہو اس کی خواہش پرستی کا علاج نہ تو تقلید میں ہے نہ ترکِ تقلید میں، یہاں یہ خواہش پرستی زیرِ بحث نہیں، بلکہ گفتگو اس سنگین خواہش پرستی کی ہورہی ہے جس نے آج سود، شراب، قمار، بے پردگی، اور دنیا بھر کے منکرات کو شرعی طور پر حلال ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا ہے، آج پورا عالمِ اسلام اُس تجدد اور اباحیت پسندی کی لپیٹ میں ہے، جس نے "اجتہاد" اور "آزادیٔ فکر" کے نام پر دین کی ایک ایک چُول ہلانے کی قسم کھائی ہوئی ہے، یہ تمام لوگ جو آج سود اور قمار کو حلال کرنے کے لئے قرآن وحدیث کے حوالوں سے مقالے لکھ رہے ہیں، اور جنھوں نے عورت کو "پردہ" کی قید سے آزاد کرنے، ... فوٹوگرافی کا جواز نکالنے اور رقص وموسیقی کو سندِ جواز دینے کے لئے بھاری بھرکم "علمی ادارے" قائم کر رکھے ہیں، یہ سب لوگ "تقلیدِ شخصی" کو حرام قرار دے کر ہی

---

[۵۱] تحریکِ آزادیٔ فکر، ص ۱۴۶،

آگے بڑھے ہیں، ان کا ستہ پہلا وار اُس "تقلید" پر ہی ہوا ہے جس نے اس قسم کے "اجتہادات" کا راستہ روک رکھا تھا، اور اُن کو سب سے زیادہ مدد اسی پروپیگنڈے سے ملی ہے کہ ائمۂ مجتہدین کی تقلید حرام اور شرک ہے، اور اسلام نے کسی کی تقلید کا سبق دینے کے بجائے "آزادیٔ فکر" کا راستہ دکھایا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ عہدِ حاضر کے اباحیت پسندوں نے تو ان فقہاءِ کرام کی دُور بین نگاہوں کی پوری پوری تصدیق کر دی ہے جنھوں نے خواہش پرستی کے سدِّ باب کے لئے تقلیدِ شخصی کو لازم کیا تھا، چنانچہ جب تک عالمِ اسلام میں تقلیدِ شخصی کا عام رواج رہا اُس وقت تک ان اباحیت پسندوں کو کھُل کھیلنے کا موقع نہ مل سکا، لیکن جب سے اس پروپیگنڈے نے رواج پایا ہے کہ تقلیدِ شخصی حرام و شرک ہے، اور جب سے "اجتہاد" کے نام پر ہر کس و ناکس نے قرآن و سنت پر مشقِ ستم شروع کی ہے، اس وقت سے دین کے قطعی احکام اور مسلّم مسائل بھی ملحدین کی تحریف کا نشانہ بنے ہوئے ہیں،

تقلید اور نئے پیش آمدہ مسائل

(۹) تقلیدِ شخصی پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس سے زندگی میں تنگی پیدا ہوتی ہے، اور زمانے میں جو نئے مسائل پیش آتے ہیں اُن کا حل نہیں ملتا،

اس کا جواب یہ ہے کہ "متبحر فی المذہب کی تقلید" کے بیان میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایک متبحر عالم کی تقلید عوام کی تقلید سے بہت مختلف ہوتی ہے، چنانچہ تقلیدِ شخصی ہی کے تحت ایک درجہ "اجتہاد فی المسائل" کا ہے، یعنی جن نئے پیش آنے والے مسائل کا کوئی جواب مجتہد کے اقوال میں نہیں ہے، اُن کا حکم مجتہد کے اصولوں کی روشنی میں قرآن و سنت سے مستنبط کرنا، اس قسم کا اجتہاد تقلیدِ شخصی کے باوجود ہر دَور میں ہوتا رہا ہے، لہٰذا تقلیدِ شخصی سے نئے مسائل کے حل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی،

اس کے علاوہ زمانے اور عُرف کے تغیّر سے جن مسائل میں فرق پڑتا ہے اُن میں ایک مذہب کے علماء غور و فکر اور مشورے سے احکام کے تغیّر کا فیصلہ کر سکتے ہیں،

نیز جہاں مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہو وہاں اس خاص مسئلے میں کسی دوسرے مجتہد کے قول پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے، جس کی شرائط اصولِ فقہ وفتویٰ کی کتابوں میں موجود ہیں، چنانچہ علمائے احناف نے انہی وجوہ سے بہت سے مسائل میں امام ابوحنیفہ رح کا قول چھوڑ دیا ہے، مثلاً استیجار علیٰ تعلیم القرآن امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک ناجائز تھا، لیکن زمانے کے تغیر کی وجہ سے بعد کے فقہاء حنفیہ رح نے اسے جائز قرار دیا، اسی طرح مفقود الخبر، عنّین اور متعنّت وغیرہ کی بیوی کے لئے اصل حنفی مذہب میں گلو خلاصی کی کوئی صورت نہ تھی، چنانچہ متأخرین علمائے حنفیہ رح نے ان تمام مسائل میں مالکی مذہب کو اختیار کرکے اس پر فتویٰ دیا، جس کی تفصیل حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ" میں موجود ہے

آج بھی جن مسائل میں یہ محسوس ہو کہ مسلمانوں کی کوئی واقعی اجتماعی ضرورت داعی ہے، وہاں متبحر علماء ائمہ اربعہ میں سے کسی دوسرے امام کے مسلک کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرسکتے ہیں، البتہ اس کے لئے ایک تو اس بات کی احتیاط لازم ہے کہ تلفیق کی صورت پیدا نہ ہو، یعنی کسی مجتہد کا مسلک ادھورا نہ لیا جائے، بلکہ اس کی پوری شرائط اور تفاصیل کو اپنایا جائے، اور اس معاملے میں خود اس مذہب کے ماہر علماء سے رجوع کرکے ان سے اس کی تفصیلات معلوم کی جائیں، جیسا کہ ... "الحیلۃ الناجزۃ" کی تصنیف کے وقت کیا گیا، دوسرے اس معاملے میں، انفرادی آراء پر اعتماد کرنے کے بجائے اس بات کی ضرورت ہو کہ متبحر فی المذہب علماء کے باہمی مشورے اور اتفاق سے کوئی فیصلہ کیا جائے،

اس طریقِ کار سے واضح رہے کہ تقلیدِ شخصی مسلمانوں کی کسی بھی اجتماعی ضرورت کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ تقلید کے دائرے میں رہتے ہوئے مذکورہ طریقِ کار کے تحت نہایت حُسن و خوبی اور حزم و احتیاط کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل حل ہوسکتے ہیں[1]

---

[1] مسلمانوں کی حقیقی ضرورت کے وقت کسی دوسرے مجتہد کے قول پر فتویٰ دینے کی شرائط

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حنفی مسلک اور عمل بالحدیث

(۱۰) ایک اعتراض خاص طور سے حنفیہؒ پر کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ حنفیہؒ جن احادیث سے استدلال کرتے ہیں وہ اکثر ضعیف ہیں، لیکن یہ اعتراض درحقیقت محض تعصب کی پیداوار ہے،

اس اعتراض کا اصل جواب تو یہ ہی کہ حنفیہؒ کی کتابوں کا انصاف اور حقیقت پسندی سے مطالعہ کیا جائے تو حقیقتِ حال واضح ہو جائے گی، خاص طور سے مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ اس معاملے میں نہایت مفید ہوگا:۔

(۱) شرح معانی الآثار للطحاویؒ (۲) فتح القدیر لابن الہمامؒ (۳) نصب الرایہ للزیلعیؒ (۴) الجوہر النقی للماردینیؒ (۵) عمدۃ القاری للعینیؒ (۶) فتح الملہم، لمولانا العثمانیؒ (۷) بذل المجہود لمولانا السہارنپوریؒ (۸) اعلاء السنن لمولانا ظفر احمد العثمانیؒ، (۹) معارف السنن لمولانا البنوری مدظلہم (۱۰) فیض الباری شرح صحیح البخاریؒ،

ان کتابوں میں قرآن و سنت سے حنفی مسلک کے دلائل شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں،

البتہ یہاں چند اصولی باتوں کی مختصراً نشان دہی مناسب ہے:۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ صحیح احادیث صرف بخاریؒ اور مسلمؒ ہی میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ حدیث کی صحت کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس کی اسناد اصولِ حدیث کی شرائط پر پوری اُترتی ہے یا نہیں؟ چنانچہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے علاوہ سینکڑوں ائمہ حدیث نے احادیث کے مجموعے مرتب فرمائے ہیں، اُن میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور ان کی مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو رد المحتار باب الرجعۃ مطلب التحلیل، ج ۲ ص ۵۵۶ و کتاب الشہادۃ باب قبول الشہادۃ ج ۴ ص ۳۰۴ و کتاب الحدود، حد السرقۃ ص ۲۱۸ و فتاوی عالمگیریہ کتاب القضاء، باب ثامن ج ۳ ص ۲۷۵ والحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ مؤلفہ حضرت مولانا تھانویؒ، و فیض القدیر شرح الجامع الصغیر للمناویؒ ج ۱ ص ۲۱۰ حدیث "اختلاف امتی رحمۃ"

جو حدیث بھی مذکورہ شرائط پر پوری اترتی ہو وہ درست ہوگی، اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو حدیث صحیحین کے علاوہ کسی اور کتاب میں مذکور ہو وہ لازماً مرجوح ہی ہو، بلکہ دوسری کتابوں کی احادیث بھی بسا اوقات صحیحین کے معیار کی ہو سکتی ہیں، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی کتابوں کی کوئی حدیث سنداً صحیحین سے بھی اعلیٰ معیار کی ہو، مثلاً ابن ماجہ صحاح ستہ میں چھٹے نمبر کی کتاب ہے، لیکن اس میں بعض احادیث جس اعلیٰ سند کے ساتھ آئی ہیں صحیحین میں اتنی اعلیٰ سند کے ساتھ نہیں آئیں (ملاحظہ ہو ماتمس الیہ الحاجۃ)۔

لہٰذا محض یہ دیکھ کر کسی حدیث کو ضعیف کہہ دینا کسی طرح درست نہیں کہ وہ صحیحین میں یا صحاح ستہ میں موجود نہیں ہے، بلکہ اصل دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اصولِ حدیث کے لحاظ سے اس کا کیا مقام ہے؟ اگر یہ بات ذہن میں رہے تو حنفیہ کے مسلک پر بہت سے وہ اعتراضات خود بخود دور ہو جاتے ہیں جو بعض سطح بیں حضرات وارد کیا کرتے ہیں،

(۳) دوسری بات یہ ہے کہ ائمہ مجتہدین کے درمیان سینکڑوں فقہی مسائل میں جو اختلافات واقع ہوئے ہیں اس کا بنیادی سبب ہی یہ ہے کہ ہر مجتہد کا طرزِ استدلال اور طریقِ استنباط جدا ہوتا ہے، مثلاً بعض مجتہدین کا طرز یہ ہے کہ اگر ایک مسئلے میں احادیث بظاہر متعارض ہوں تو وہ اُس حدیث کو لے لیتے ہیں جس کی سند سب سے زیادہ صحیح ہو، خواہ دوسری احادیث بھی سنداً درست ہوں، اس کے برخلاف بعض حضرات اُن روایات کی ایسی تشریح کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسری سے ہم آہنگ ہو جائیں، اور تعارض باقی نہ رہے، خواہ کم درجہ کی صحیح یا حسن حدیث کو اصل قرار دے کر اصح حدیث کی خلاف ظاہر توجیہ کرنی پڑے، اور بعض مجتہدین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس حدیث کو اختیار کر لیتے ہیں جس پر صحابہؓ و تابعینؒ کا عمل رہا ہو، اور دوسری احادیث میں تاویل کرتے ہیں،

غرض ہر مجتہد کا اندازِ نظر جدا گانہ ہے، اور ان میں سے کسی کو بھی یہ الزام

نہیں دیا جاسکتا کہ اس نے صحیح احادیث کو ترک کردیا ہے، امام ابوحنیفہؒ عموماً احادیث میں تطبیق کی کوشش فرماتے ہیں، اور حتی الامکان ہر حدیث پر عمل کی کوشش کرتے ہیں، خواہ وہ سنداً مرجوح ہی کیوں نہ ہو، بلکہ اگر ضعیف حدیث کا کوئی معارض موجود نہ ہو تو اس پر بھی عمل کرتے ہیں، خواہ وہ قیاس کے خلاف ہو، مثلاً قہقہہ سے وضو ٹوٹ جانے، شہد پر زکوٰۃ واجب ہونے وغیرہ کے متعدد مسائل میں انھوں نے ضعیف احادیث کی بناء پر قیاس کو ترک کردیا ہے،

(۳) احادیث کی تصحیح و تضعیف بھی ایک اجتہادی معاملہ ہے، یہی وجہ ہے کہ علمائے جرح و تعدیل کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہوتا رہتا ہے، ایک حدیث ایک امام کے نزدیک صحیح یا حسن ہوتی ہے اور دوسرا اسے ضعیف قرار دیتا ہے، چنانچہ حدیث کی کتابوں کو دیکھنے سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے، لہٰذا بعض اوقات امام ابوحنیفہؒ اپنے اجتہاد سے کسی حدیث کو قابلِ عمل قرار دیتے ہیں اور دوسرے مجتہدین اسے ضعیف سمجھ کر ترک کردیتے ہیں، اور امام ابوحنیفہؒ چونکہ خود مجتہد ہیں، اس لئے دوسرے مجتہدین کے اقوال ان پر حجت نہیں ہیں،

(۴) بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک حدیث امام ابوحنیفہؒ کو صحیح سند کے ساتھ پہنچی جس پر انھوں نے عمل کیا، لیکن ان کے بعد کے راویوں میں سے کوئی راوی ضعیف آگیا، اس لئے بعد کے ائمہ نے اسے چھوڑ دیا، لہٰذا امام ابوحنیفہؒ پر کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا،

(۵) اگر کوئی محدث کسی حدیث کو ضعیف قرار دیتا ہے تو بعض اوقات اس کے پیشِ نظر اس حدیث کا کوئی خاص طریق ہوتا ہے، لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ کسی دوسرے طریق میں وہی حدیث صحیح سند کے ساتھ آئی ہو، مثلاً من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ کی حدیث کو بعض محدثین نے کسی خاص طریق کی بناء پر ضعیف کہا ہے، لیکن مسند احمد بن منیعؒ اور کتاب الآثار وغیرہ میں یہی حدیث بالکل صحیح سند کے ساتھ آئی ہے،

(۶) بسا اوقات ایک حدیث سنداً ضعیف ہوتی ہے، لیکن چونکہ وہ متعدد طرق اور اسانید سے مروی ہوتی ہے، اور اسے مختلف اطراف سے متعدد راوی روایت کرتے ہیں، اس لئے اُسے قبول کرلیا جاتا ہے، اور محدثین اسے حسن لغیرہ کہتے ہیں، ایسی حدیث پر عمل کرنے والے کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ضعیف حدیث سے استدلال کیا ہے،

(۷) بعض اوقات ایک حدیث ضعیف ہوتی ہے، اور حدیث کے ضعیف ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی سند میں کوئی راوی ضعیف آگیا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ضعیف راوی ہمیشہ غلط ہی روایت کرے، لہٰذا اگر دوسرے قوی قرائن اس کی صحت پر دلالت کرتے ہوں تو اسے قبول کرلیا جاتا ہے، مثلاً اگر حدیث ضعیف ہو لیکن تمام صحابہؓ اور تابعینؒ اُس پر عمل کرتے چلے آرہے ہیں تو یہ اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ یہاں ضعیف راوی نے صحیح روایت نقل کی ہے، چنانچہ حدیث "لَاوَصِیَّۃَ لِوَارِث" کو اسی بنا پر تمام ائمہ مجتہدین نے معمول بہ قرار دیا ہے، بلکہ بعض اوقات اس بنا پر ضعیف روایت کو صحیح سند والی روایت پر ترجیح بھی دیدی جاتی ہے، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا واقعہ ہے کہ وہ حضرت ابوالعاصؓ کے نکاح میں تھیں، وہ شروع میں کافر تھے، بعد میں مسلمان ہوئے، اب اس میں روایات کا اختلاف ہے کہ اُن کے اسلام قبول کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سابق نکاح برقرار رکھا تھا یا نیا نکاح کرایا تھا، حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت میں ہے کہ آپ نے ان کا نیا نکاح کرایا اور مہر بھی نیا مقرر ہوا تھا، اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ آپ نے سابق نکاح برقرار رکھا تھا، نیا نکاح نہیں کرایا تھا، ان دونوں روایتوں میں سے پہلی روایت ضعیف ہے، اور دوسری صحیح ہے، لیکن امام ترمذیؒ جیسے محدث نے تعاملِ صحابہؓ کی وجہ سے پہلی روایت کو اس کے ضعف کے باوجود ترجیح دی ہے،[۱]

---

[۱] دیکھئے جامع ترمذی، کتاب النکاح باب الزوجین المشرکین یسلم احدہما، یہ مثال امام ترمذیؒ کے نظریہ کے مطابق پیش کی گئی ہے، حنفیہؒ کا موقف قدرے مختلف ہے،

اسی طرح بعض مرتبہ امام ابو حنیفہؒ بھی اس قسم کے قوی قرائن کی بنا پر کسی ضعیف حدیث پر عمل فرما لیتے ہیں، لہٰذا اس کو ان کے خلاف بطور الزام پیش نہیں کیا جا سکتا،

(۸) بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کو صحیح سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی، اس بنا پر اُسے حدیث کے خلاف سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ وہ حدیث کے عین مطابق ہوتا ہے، اس قسم کی غلطیوں میں بعض مشہور اہلِ علم بھی مبتلا ہو گئے ہیں مثلاً مشہور اہلِ حدیث عالم حضرت مولانا محمد اسمٰعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ نے تعدیلِ ارکان کے مسئلے میں حنفیہ کے موقف پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"حدیث شریف میں ہے کہ ایک آدمی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز پڑھی، اس نے رکوع وسجود اطمینان سے نہیں کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تین دفعہ فرمایا: صَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ (تم نماز پڑھو، تم نے نماز نہیں پڑھی) یعنی شرعاً تمہاری نماز کا کوئی وجود نہیں، اسی حدیث کی بنا پر اہلِ حدیث اور شوافع وغیرہم کا بھی یہی خیال ہے کہ اگر رکوع اور سجود میں اطمینان نہ ہو تو نماز نہیں ہوگی، احناف فرماتے ہیں رکوع اور سجود کا معنی معلوم ہو جانے کے بعد ہم حدیث کی تشریح اور نماز کی نفی قبول نہیں کرتے"[۱]

حالانکہ یہ حنفیہ کے مسلک کی غلط ترجمانی ہے، واقعہ یہ ہے کہ حنفیہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ رکوع اور سجدہ تعدیل کے ساتھ نہ کیا جائے تو نماز واجب الاعادہ ہوگی لہٰذا وہ "صَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ" پر پوری طرح عمل پیرا ہیں، البتہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک "فرض" اور "واجب" میں فرق ہے، جبکہ دوسرے ائمہ مجتہدین ان دونوں اصطلاحوں میں فرق نہیں کرتے، امام ابو حنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ نماز کے فرائض وہ ہیں جو قرآن کریم یا متواتر احادیث سے قطعی طریقہ پر ثابت ہوں جیسے رکوع اور سجدہ وغیرہ، اور واجبات وہ ہیں جو اخبارِ احاد سے ثابت ہوں، عملی طور پر

---

[۱] تحریکِ آزادیِ فکر، ص ۳۲،

اگر اس لحاظ سے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں کہ جس طرح فرض کو چھوڑنے سے نماز دُہرائی جائے گی، اسی طرح واجب کو چھوڑنے سے بھی دُہرائی جائے گی، لیکن دونوں میں یہ نظری فرق ہے کہ فرض کو چھوڑنے سے آدمی تارکِ نماز کہلائے گا، اور اُس پر تارکِ نماز کے احکام جاری ہوں گے، اور واجب کو چھوڑنے سے تارکِ نماز نہیں کہلائے گا، بلکہ نماز کے ایک واجب کا تارک کہلائے گا، بالفاظِ دیگر فرضِ نماز تو ادا ہو جائے گا لیکن اُس پر واجب ہوگا کہ وہ نماز لوٹائے، اور یہ بات حدیث کے مفہوم کے خلاف نہیں، بلکہ اس بات کی تصریح خود اسی حدیث کے آخر میں موجود ہے،

جامع ترمذیؒ میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن صاحب سے یہ فرمایا کہ "صَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ" (نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی)، تو یہ بات صحابہؓ کو بھاری معلوم ہوئی، کہ نماز میں تخفیف کرنے والوں کو تارکِ نماز قرار دیا جائے، لیکن تھوڑی دیر بعد جب آپؐ نے اُن صاحب کو نماز کا صحیح طریقہ بتاتے ہوئے تعدیلِ ارکان کی تاکید فرمائی، تو ارشاد فرمایا:-

فاذا فعلت ذلك فقد تمت صلوتك وان انتقصت منه شيئا انتقصت من صلاتك،

"جب تم یہ کام کر دگے تو تمھاری نماز پوری ہوگی، اور اگر اس میں تم نے کمی کی تو تمھاری نماز میں کمی واقع ہو جائے گی"

حضرت رفاعہؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں فرماتے ہیں:-

وكان هذا أهون عليهم من الاولى انه من انتقص من ذلك شيئا انتقص من صلاته ولم تذهب كلها[1]

"اور یہ بات صحابہؓ کو پہلی بات سے زیادہ آسان معلوم ہوئی، کہ ان چیزوں میں کمی کرنے سے نماز میں کمی تو واقع ہوگی لیکن پوری نماز کالعدم نہیں ہوگی"

---

[1] جامع ترمذیؒ، باب ما جاء فی وصف الصلوٰۃ،

حدیث کا یہ جملہ صراحۃً وہی تفصیل بتارہا ہے جس پر حنفیہ کا عمل ہے، وہ حدیث کے ابتدائی حصہ پر عمل کرتے ہوئے اس بات کے بھی قائل ہیں کہ تعدیلِ ارکان چھوڑنے سے نماز کو دُہرانا پڑے گا، اور آخری حصہ پر عمل کرتے ہوئے اس کے بھی قائل ہیں کہ اس کو چھوڑنے سے آدمی کو تارکِ نماز نہیں کہیں گے، بلکہ نماز میں کمی اور کوتاہی کرنیوالا کہیں گے، اس تشریح کے بعد غور فرمایئے کہ حنفیہ کے موقف کی ترجمانی کہ وہ "حدیث کی تشریح قبول نہیں کرتے" اُن کے مسلک کی کتنی غلط اور اُلٹی تعبیر ہے،

بہرحال مقصد یہ تھا کہ بعض اوقات حنفیہ کے کسی مسلک پر اعتراض کا منشأ یہ ہوتا ہے کہ مسلک کی قرار واقعی تحقیق نہیں کی جاتی،

یہ چند اصولی باتیں ذہن میں رکھ کر حنفیہ کے دلائل پر غور کیا جائے گا تو انشاء اللہ یہ غلط فہمی دُور ہوجائے گی، کہ حنفیہ کے مستدلات ضعیف ہیں، یا وہ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ایک مجتہد کو یہ تو حق ہے کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کے کسی استدلال سے اختلاف کرے، یا اُن کے کسی قول سے متفق نہ ہو، لیکن اُن کے مذہب پر علی الاطلاق ضعف کا حکم لگا دینا یا یہ کہنا کہ وہ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں ظلمِ عظیم سے کم نہیں،

یوں تو بے شمار محقق علماء نے امام ابوحنیفہؒ کے مدارکِ اجتہاد کی تعریف کی ہے لیکن یہاں ہم ایک ایسے شافعی عالم کے چند اقوال نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں جو قرآن وحدیث اور فقہ وتصوّف کے امام سمجھے جاتے ہیں، یعنی حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی شافعی رحمۃ اللہ علیہ، یہ بذاتِ خود حنفی نہیں ہیں، لیکن انھوں نے ایسے لوگوں کی سخت تردید کی ہے جو امام ابوحنیفہؒ یا ان کے فقہی مذہب پر مذکورہ اعتراضات کرتے ہیں، بلکہ انھوں نے اپنی کتاب "المیزان الکبریٰ" میں کئی فصلیں امام ابوحنیفہؒ کے دفاع ہی کے لئے قائم فرمائی ہیں، وہ فرماتے ہیں:۔

اعلم یا اخی انی لم اجب عن الامام فی ھذہ الفصول
بالصدور واحسان الظن فقط، کما یفعل بعضھم

(انما اجبت عنه بعد التتبع والفحص فی کتب الادلة ..... ومذهبه اول المذاهب تدوینا وآخرها انقراضاً کما قاله بعض اهل الکشف ..... وقد تتبعت بحمد الله اقواله واقوال اصحابه لما الفت کتاب ادلة المذاهب فلم اجد قولاً من اقواله او اقوال اتباعه الا وهو مستند الی اٰیة اوحدیث او اثر او الی مفهوم ذلک، اوحدیث ضعیف کثرت طرقه او الی قیاس صحیح علی اصل صحیح، فمن اراد الوقوف علی ذلک فلیطالع کتابی المذکور[1]

"یاد رکھئے کہ ان فصلوں میں (جو میں نے امام ابو حنیفہ رحؒ کے دفاع کے لئے قائم کی ہیں) میں نے امام ابو حنیفہؒ کی طرف سے کوئی جواب محض قلبی عقیدت یا حسنِ ظن کی بناء پر نہیں دیا، جیسا کہ بعض لوگوں کا دستور ہے، بلکہ میں نے یہ جوابات دلائل کی کتابوں کی پوری چھان بین کے بعد دیتے ہیں ..... اور امام ابو حنیفہ رحؒ کا مذہب تمام مجتہدین کے مذاہب میں سب سے پہلے مدوّن ہونے والا مذہب ہے، اور بعض اہلِ کشف کے قول کے مطابق سب سے آخر میں ختم ہوگا ..... اور جب میں نے فقہی مذاہب کے دلائل پر کتاب لکھی تو اس وقت امام ابو حنیفہ رحؒ اور ان کے اصحاب کے اقوال کا تتبع کیا، مجھے اُن کے یا اُن کے متبعین کا کوئی قول ایسا نہیں ملا جو مندرجہ ذیل شرعی حجتوں میں سے کسی پر مبنی نہ ہو، یا تو اس کی بنیاد کوئی آیت ہوتی ہے یا کوئی حدیث، یا صحابی کا اثر، یا ان سے مستنبط ہونے والا

---

[1] المیزان الکبریٰ، للشعرانی رحؒ ج ۱ ص ۶۳ و ۶۴ مطبوعہ مصطفیٰ البابی مصر،

کوئی مفہوم، یا کوئی ایسی ضعیف حدیث جو بہت سی اسانید اور طرق سے مروی ہو، یا کوئی ایسا صحیح قیاس جو کسی صحیح اصل پر متفرع ہو، جو شخص اس کی تفصیلات جاننا چاہے وہ میری اس کتاب کا مطالعہ کرے۔"

آگے انھوں نے ان لوگوں کی تردید میں ایک پوری فصل قائم کی ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے قیاس کو حدیث پر مقدم رکھا ہے، اس الزام کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :۔

اعلم ان هذا الكلام صدر من متعصب على الامام متهور فی دینه غیر متورع فی مقاله، غافلاً عن قوله تعالى، إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ الخ

یاد رکھیے کہ ایسی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو امام ابوحنیفہؒ سے تعصب رکھتے ہیں، اور اپنے دین کے معاملے میں جری اور اپنی باتوں میں غیر محتاط ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے غافل ہیں کہ "بلاشبہ کان، آنکھ، اور دل ان میں سے ہر ایک کے بارے میں (محشر میں) سوال ہوگا"

آگے انھوں نے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوریؒ، مقاتل ابن حیانؒ، حماد بن سلمہؒ اور حضرت جعفر صادقؒ امام ابوحنیفہؒ کے پاس آئے، اور ان سے اس پروپیگنڈے کی حقیقت معلوم کی کہ وہ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے ہیں، اس کے جواب میں امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ میں تو قیاس کو قرآن و حدیث ہی نہیں، آثارِ صحابہؓ کے بھی بعد استعمال کرتا ہوں، اور صبح سے زوال تک امام ابوحنیفہؒ ان حضرات کو اپنا موقف سمجھاتے رہے، آخر میں یہ چاروں حضرات یہ کہہ کر تشریف لے گئے کہ :۔

انت سید العلماء فاعف عنا فیما مضی منا من وقیعتنا فیك بغیر علم،

"آپ تو علماء کے سردار ہیں، لہٰذا ہم نے ماضی میں آپ کے بارے میں صحیح علم کے بغیر جو بدگمانیاں کی ہیں اُن پر آپ ہمیں معاف فرمایئے"

اس کے بعد امام شعرانی رحؒ نے ایک اور فصل اُن لوگوں کی تردید میں قائم کی ہے، جو امام ابوحنیفہ رحؒ کے اکثر دلائل پر ضعیف ہونے کا الزام لگاتے ہیں، اور مبسوط بحث کے ذریعہ اس بے بنیاد الزام کی حقیقت واضح کی ہے، پھر ایک اور فصل انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے قائم کی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحؒ کا مسلک دینی اعتبار سے محتاط ترین مذہب ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:-

فانی بحمد اللہ تتبعت مذھبہ فوجدتہ فی غایۃ الاحتیاط والورع،

"بحمد اللہ میں نے امام ابوحنیفہ رحؒ کے مذہب کا تتبع کیا ہے اور اس کو احتیاط اور تقویٰ کے انتہائی مقام پر پایا ہے"

امام شعرانی رحؒ کے یہ چند اقوال محض نمونے کے لئے پیش کر دیئے گئے ہیں، ورنہ اُن کی یہ پوری بحث قابل مطالعہ ہے[۱]

امام ابوحنیفہؒ اور علمِ حدیث

(۱۱) ایک سطحی اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے، کہ امام ابوحنیفہ رحؒ کے پاس احادیث زیادہ نہیں تھیں یا وہ علمِ حدیث میں کمزور تھے،

لیکن یہ بے بنیاد اعتراض بھی درحقیقت کم علمی اور تعصب کی پیداوار ہے، ورنہ جلیل القدر اور محقق علماء صرف علمِ فقہ ہی میں نہیں، علمِ حدیث میں بھی ان کی جلالتِ قدر پر متفق ہیں، اور صرف حنفی علماء نے نہیں... دوسرے مذاہب کے

---

[۱] ملاحظہ ہو المیزان الکبریٰ، ج ۱ ص ۶۳ تا ص ۷۰،

علماء نے بھی علمِ حدیث میں اُن کے مقامِ بلند کا اعتراف کیا ہے، تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں، چند محدثین کے اقوال پیش خدمت ہیں :-

(۱) حضرت ابن جریج حدیث اور فقہ کے معروف امام ہیں، اور امام شافعیؒ کا مذہب بیشتر انہی سے ماخوذ ہے، اُن کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نقل کرتے ہیں کہ جب انھیں امام ابوحنیفہؒ کی وفات کی خبر پہنچی تو انھوں نے شدید صدمہ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "اَیُّ علم ذھب" (کیسا علم چلا گیا)[۱]

(۲) مکی بن ابراہیمؒ امام بخاریؒ کے وہ استاذ ہیں کہ ان کی بیشتر ثلاثیات انہی سے مروی ہیں، وہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں، اور حافظ مزیؒ نے تہذیب الکمال میں امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں اُن کا یہ قول نقل کیا ہے :-

کان اعلم اھل زمانہ[۲]

"وہ اپنے اہلِ زمانہ میں سب سے بڑے عالم تھے"

واضح رہے کہ متقدمین کی اصطلاح میں "علم" کا لفظ علمِ حدیث ہی کے لئے بولا جاتا تھا، اس لئے یہ شہادتیں امام صاحبؒ کے علمِ حدیث ہی سے متعلق ہیں۔

(۳) حضرت شعبہ بن الحجاجؒ کو امیر المؤمنین فی الحدیثؒ کہا جاتا ہے، اور وہ جرح و تعدیل کے سب سے پہلے امام ہیں، وہ فرماتے ہیں :-

کان واللہ حسن الفھم جیّد الحفظ

"خدا کی قسم وہ بہترین فہم والے اور عمدہ حافظہ والے تھے"

اور جب حضرت شعبہؒ کو امام اعظمؒ کی وفات کی خبر ملی تو انھوں نے فرمایا :-

طفیٔ عن الکوفۃ نور العلم، اما انھم لا یرون مثلہ ابداً[۳]

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۰ [۲] حاشیہ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۱، [۳] الخیرات الحسان لابن حجر المکی ص ۳۲ و ۱۷، ماخوذ از انجاء الوطن ص ۸ و ۱۷،

"کوفہ سے علم کا نور بجھ گیا، یہ لوگ اب امام ابوحنیفہ رح جیسا شخص نہیں دیکھیں گے"۔[1]

(۴) امام ابوداؤد رح فرماتے ہیں: انّ اباحنیفۃ کان اماماً (امام ابوحنیفہ رح امام تھے)[2]

(۵) یحییٰ بن معین رح جرح و تعدیل کے امام ہیں، وہ فرماتے ہیں "کان ابوحنیفۃ ثقۃ لا یحدث بالحدیث الا بما یحفظہ" نیز فرماتے ہیں: "کان ابوحنیفۃ ثقۃ فی الحدیث"۔ نیز یحییٰ بن معین رح حضرت یحییٰ بن سعید القطان رح کا یہ اعتراف نقل کرتے ہیں کہ "قد اخذنا باکثر اقوالہ"[3] (ہم نے امام ابوحنیفہ رح کے اکثر اقوال پر عمل کیا ہے) ایک اور موقع پر یحییٰ بن معین رح سے پوچھا گیا کہ کیا امام ابوحنیفہ رح حدیث میں ثقہ ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا "نعم ثقۃ ثقۃ"[4] (ہاں ثقہ ہیں ثقہ ہیں)

یہ اقوال محض نمونے کے لئے پیش کئے گئے ہیں، ورنہ اس قسم کے اقوال بیشمار ہیں، ادھر امام ابوحنیفہ رح نے علم حدیث میں "کتاب الآثار" اس وقت تالیف فرمائی، جبکہ حدیث کی قدیم ترین مروّجہ کتابیں مثلاً مؤطا امام مالک رح، مصنف عبدالرزاق رح اور مصنف ابن ابی شیبہ رح وغیرہ بھی وجود میں نہیں آئی تھیں، اور امام زرنجری رح فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رح نے یہ کتاب چالیس ہزار حدیثوں میں سے انتخاب کرکے مرتب فرمائی ہے[5] اس کے علاوہ جلیل القدر محدثین نے آپ کی سترہ مسانید مرتب فرمائی ہے، جن میں سے کوئی بھی شاید سننِ شافعی رح سے حجم میں کم نہ ہو، مسانید مرتب کرنے والوں میں حافظ ابن عدی رح جیسے نقادِ حدیث شامل ہیں، جو شروع میں امام صاحب رح سے بدظن تھے، لیکن بعد میں انھوں نے اپنے سابقہ اقوال کے کفارے کے طور پر امام ابوحنیفہ رح کی مسند مرتب فرمائی،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۱ ص ۱۶۰ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۰،
[3] مناقب الامام الاعظم للموفق ج ۱ ص ۱۹۲ [4] مناقب الامام الاعظم للموفق ج ۱ ص صفحہ ۹۵ و ۹۶ طبع دکن ۱۳۲۱ھ،

بہرحال؛ علمِ حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کا مقام ایک طویل الذیل موضوع ہے، جس کی یہاں گنجائش نہیں، مذکورہ باتیں محض نمونہ کے طور پر عرض کی گئی ہیں[1]، لیکن آخر میں ہم مشہور اہلِ حدیث عالم نواب صدیق حسن خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت نقل کرتے ہیں، انھوں نے امام ابوحنیفہؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-

وکان عالماً عاملاً زاهداً عابداً ورعاً تقیاً کثیر الخشوع دائم التضرع الی الله تعالیٰ،

"وہ عالم باعمل تھے، عابد و زاہد تھے، متقی پرہیزگار تھے، انہیں خشوع بہت تھا، اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی میں لگے رہتے تھے"

اور امام ابوحنیفہؒ کے فضائل و مناقب میں بہت سی باتیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

ومناقبه وفضائله کثیرة، وقد ذکر الخطیب فی تاریخه منها شیئاً کثیراً، ثم اعقب ذلك بذکر ما کان الالیق ترکه والاضراب عنه، فمثل هذا الامام لا یشك فی دینه ولا فی ورعه وتحفظه، ولم یکن یعاب بشیٔ سوی قلة العربیة[2]،

"امام ابوحنیفہؒ کے فضائل و مناقب بہت زیادہ ہیں، اور خطیب بغدادیؒ نے اپنی تاریخ میں اُن کا بڑا حصہ نقل کیا ہے، لیکن اس کے بعد انھوں نے بعض ایسی باتیں بھی لکھدی ہیں جن کا ترک کرنا اور اُن

---

[1] اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے اردو میں مولانا محمد علی کاندھلوی کی کتاب "امام اعظم اور علمِ حدیث" اور عربی میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی "انجاء الوطن" قابلِ دید ہے،

[2] التاج المکلل، مؤلفہ نواب صدیق حسن خانؒ ص ۱۳۶ تا ۱۳۸ ترجمہ ۱۱۹ مطبوعہ بمبئی ۱۳۸۳ھ،

اعراض کرنا زیادہ بہتر تھا، کیونکہ ابو حنیفہؒ جیسے امام کے دین و دیانت
اور احتیاط و تقویٰ میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا، اور اُن پر عربیت
کی کمی کے سوا کوئی عیب نہیں لگایا جاتا تھا،

یہاں نواب صاحبؒ نے امام ابو حنیفہؒ پر "عربیت کی کمی" کا اعتراض تو نقل کیا کہ (جس کی حقیقت آگے آرہی ہے) لیکن حدیث کے معاملے میں اُن پر کئے جانے والے اعتراضات کو لائقِ ذکر بھی نہیں سمجھا، واضح رہے کہ نواب صاحبؒ کی کتاب "التاج المکلل" علمائے حدیث کے تذکرے میں ہے، اور انھوں نے کتاب کے شروع میں لکھا ہے کہ میں اس میں "اہل العلم بالحدیث" کے احوال نقل کروں گا، لہٰذا امام صاحبؒ کا تذکرہ انھوں نے محدث ہی کی حیثیت میں کیا ہے،

رہا یہ کہ امام صاحبؒ پر عربیت کی کمی کا اعتراض کیا جاتا تھا، سو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحبؒ نے یہ بات قاضی ابن خلکانؒ سے نقل کی ہے، کیونکہ انھوں نے بھی بعینہٖ یہی الفاظ استعمال کئے ہیں، لیکن نواب صاحبؒ نے قاضی ابن خلکانؒ کی اگلی عبارت نقل نہیں فرمائی، جس سے اس اعتراض کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ پر اس الزام کی بنیاد صرف ایک مشہور واقعہ پر ہے، اور وہ یہ ہے کہ مشہور نحوی ابو عمرو بن العلاءؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے قتل شبہ عمد کا حکم دریافت کیا، کہ اس سے قصاص آتا ہے یا نہیں؟ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے مذہب کے مطابق جواب دیا کہ نہیں، انھوں نے کہا، "ولو قتلہ بالمنجنیق"؟ تو امام صاحبؒ نے جواب دیا: "ولو ضربہ بأبا قبیس"۔ امام ابو حنیفہؒ کے اس جملے پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ نحوی قواعد کی رُو سے انھیں "ولو ضربہ بأبی قبیس" کہنا چاہئے تھا، حالانکہ یہ اعتراض اس لئے درست نہیں کہ بعض اہلِ عرب اسی طرح بولتے ہیں جس طرح امام ابو حنیفہؒ نے ارشاد فرمایا،

چنانچہ قاضی ابن خلکانؒ نے اس اعتراض کو نقل کرنے کے بعد اُس کا جواب بھی دیا ہے، اور وہ یہ کہ امام ابو حنیفہؒ نے یہ جملہ اُن لوگوں کی لغت پر بولا تھا جو اسماءِ ستہ

کا اعراب ہر حالت میں الف ہی سے مانتے ہیں، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

فانّ اباھا و ابا ابا ھـا
قد بلغا فی المجد غایتاھا

حالانکہ عام نحوی قواعد کی رُو سے "ابا ابیہا" ہونا چاہئے تھا، قاضی ابن خلکانؒ یہ جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وھی لغة الکوفیّین، وابوحنیفة من اھل الکوفة[1]

"یہ کوفہ کی زبان ہے، اور امام ابوحنیفہؒ اہلِ کوفہ ہی میں سے تھے"

لہٰذا اس واقعہ کی وجہ سے امام اعظمؒ پر قلّتِ عربیّت کا الزام خود معترض کی قلّتِ عربیت کی دلیل ہے،

تقلید میں جمود

آخر میں یہ بات بھی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح تقلید کی مخالفت اور شرعی مسائل میں خود رائی قابلِ ملامت ہے اسی طرح تقلید میں جمود اور غلو بھی قابلِ مذمّت ہے، اور مندرجہ ذیل صورتیں اسی جمود اور غلو میں داخل ہیں:۔

(۱) ائمہ مجتہدین کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا جائے کہ وہ (معاذ اللہ) شارع ہیں یا وہ معصوم اور انبیاء علیہم السلام کی طرح خطاؤں سے پاک ہیں،

(۲) کسی صحیح حدیث پر عمل کرنے سے محض اس بناء پر انکار کیا جائے کہ اس بارے میں ہمارے امام سے کوئی حکم ثابت نہیں ہے، مثلاً تشہد میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہتے ہوئے شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنا بہت سی احادیث سے ثابت ہے،

---

[1] وفیات الاعیان، لابن خلکانؒ ج ۲ ص ۱۶۵،

لیکن بعض لوگوں نے اس سنت سے محض اس بنا پر انکار کر دیا کہ امام ابوحنیفہؒ سے اس کے بارے میں کوئی قول منقول نہیں، اور شاید یہی مسئلہ ہے جس کے بارے میں بعض لوگوں نے یہ انتہائی گستاخانہ جملہ کہا کہ "مارا قولِ ابوحنیفہؒ باید قولِ رسول کافی نیست" (نعوذ باللہ العلیّ العظیم) یہی وہ تقلیدِ جامد ہے، جس کی مذمت قرآن وحدیث میں آئی ہے۔

(۳) احادیثِ نبویہ کو توڑ مروڑ کر اپنے امام کے مذہب کے مطابق بنانے کے لئے ان میں ایسی دور از کار تاویلات کی جائیں جن پر خود ضمیر مطمئن نہ ہو، لیکن یہ اپنے اپنے اندازِ فکر کا معاملہ ہے، اگر کسی شخص کو حدیث کی کسی توجیہ پر واقعی شرحِ صدر ہے، اور دوسرا اسے درست نہیں سمجھتا، تو دوسرے کو پہلے شخص پر اعتراض کا حق نہیں ہے،

(۴) ایک "متبحر عالم" کو بشہادتِ قلب یہ ثابت ہو جائے کہ امام کا قول فلاں صحیح حدیث کے خلاف ہے، اور اُس حدیث کے معارض کوئی دلیل بھی نہیں ہے، اس کے باوجود وہ حدیث کو قابلِ عمل نہ سمجھے تو یہ بھی تقلید جامد ہے، اس مسئلے کی پوری تفصیل پیچھے "متبحر فی المذہب کی تقلید" کے زیرِ عنوان گزر چکی ہے، وہیں اُس کی شرائط بھی مذکور ہیں، اور حکیم الامّت حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں اس کی مختلف صورتیں بھی۔

(۵) اسی طرح یہ اعتقاد بھی تقلید کا بدترین غلو ہے کہ صرف ہمارے امام کا مسلک حق ہے اور دوسرے مجتہدین کے مذاہب (معاذ اللہ) باطل ہیں، واقعہ یہ ہے کہ تمام ائمہ مجتہدین نے اجتہاد کی شرائط کو پورا کر کے قرآن وحدیث کی صحیح مراد معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے سب کے مذاہب برحق ہیں، اور اگر کسی سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے تو اللہ کے نزدیک وہ نہ صرف معاف ہے، بلکہ اپنی کوشش صرف کرنے کی وجہ سے مجتہد کو ثواب ہوگا، جس کی تصریح احادیث میں موجود ہے، البتہ ایک مقلّد یہ اعتقاد رکھ سکتا ہے کہ میرے امام کا مسلک صحیح ہے، مگر اس میں خطا کا بھی احتمال ہے اور دوسرے مذاہب میں ائمہ سے اجتہادی خطا ہوئی ہے، لیکن ان میں صحت کا بھی احتمال ہے،

(۶) ائمہ مجتہدین کے باہمی اختلافات کو حد سے بڑھا کر پیش کرنا بھی سخت غلطی ہے

بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں ائمہ کے درمیان صرف افضل اور غیر افضل کا اختلاف ہے، جائز و ناجائز کا یا حلال و حرام کا اختلاف نہیں، مثلاً نماز میں رکوع کے وقت ہاتھ اٹھائے جائیں یا نہیں؟ آمین آہستہ کہی جائے یا زور سے؟ ہاتھ سینے پر باندھے جائیں یا ناف پر؟ ان تمام مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف محض افضلیت میں ہے، ورنہ یہ تمام طریقے سب کے نزدیک جائز ہیں، لہٰذا ان اختلافات کو حلال و حرام کی حد تک پہنچا کر امت میں انتشار پیدا کرنا کسی طرح جائز نہیں،

(۷) اور جہاں ائمہ مجتہدین کے درمیان جائز و ناجائز کا اختلاف ہے وہاں بھی اس اختلاف کو خالص علمی حدود ہی میں رکھنا ضروری ہے، ان اختلافات کو نزاع و جدال اور جنگ و پیکار کا ذریعہ بنا لینا کسی امام کے مذہب میں جائز نہیں، نہ ان اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کی عیب جوئی یا ایک دوسرے کے خلاف بدگمانی اور بدزبانی کسی مذہب میں حلال ہے، اس موضوع پر علامہ شاطبیؒ نے بڑا نفیس کلام کیا ہے، جو اہلِ علم کے لئے قابلِ مطالعہ ہے، (ملاحظہ ہو الموافقات للشاطبیؒ ج ۴ ص ۲۲۰ تا ص ۲۲۴)

آخری گذارش

مسئلہ تقلید کی حقیقت اپنی بساط کی حد تک گزشتہ صفحات میں واضح کردی گئی ہے، آخر میں ہماری گزارش یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف سے ہمارا مقصود بحث و تکرار اور مناظرہ و جدال ہرگز نہیں ہے، بلکہ امتِ مسلمہ کی اکثریت جو کسی نہ کسی فقیہ و مجتہد کی مقلد رہی ہے، اس کے موقف کی تشریح ہے، اگر نادانستہ طور پر کوئی لفظ ہمارے قلم سے ایسا نکل گیا ہو جس سے کسی صاحب کے دل کو ٹھیس پہنچے تو ہم اس سے پورے خلوص کے ساتھ معافی چاہتے ہیں،

ان صفحات کو تحریر کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کی اکثریت کا نقطۂ نظر دلائل کے ساتھ واضح ہو جائے، اور بعض حلقوں میں اس نقطۂ نظر کے خلاف

حرام و شرک ہونے کی جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں انھیں دور کرنے کے امکانات پیدا ہوں، اگر کسی صاحب کو اس نقطۂ نظر سے پھر بھی اختلاف باقی رہے تو وہ اپنے موقف پر قائم رہیں، لیکن ائمۂ مجتہدین پر شریعت سازی یا اُن کے مقلدوں پر شرک و کفر کے الزامات عائد کرنا انتہائی خطرناک طرزِ عمل ہے، جس سے ہزار بار اللہ کی پناہ مانگنا چاہیے،

ایسے حضرات کے لیے مشہور اہلِ حدیث عالم علامہ نواب صدیق حسن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے جو اُن کے لئے بہترین مشعلِ راہ ہے، وہ اپنی کتاب "ابقاء المنن بالقاء المحن" میں لکھتے ہیں :-

"ایک منت خدا کی مجھ پر یہ ہے کہ میں فقط جماعت اہلِ سنت کو فرقۂ ناجیہ جانتا ہوں، حنفی ہوں یا شافعی، مالکی ہوں یا حنبلی، یا ظاہری یا اصلِ حدیث، یا اہلِ سلوک، اور کسی کے حق میں ان میں سے گمانِ بد نہیں رکھتا، اگرچہ مجھ کو یہ بات معلوم ہے کہ ہر گروہ کے اندر ان میں سے کچھ مسائل خلافِ دلائل بھی ہیں، اور بعض موافق نصوص، بعض فتاویٰ اُن کے صحیح اور بعض ضعیف یا مردود ہیں، اس لئے حکم اکثر کو ہے نہ اقل کو، اور ائمۂ سلف سے جو عمل بعض احادیث میں متروک ہو گیا ہے اُس کے بیس عذر ہیں جو کتاب "جلب المنفعت" میں لکھے گئے ہیں، ائمۂ سلف پر طعن مخالفتِ سنت کا کرنا انصاف کا خون بہانا ہے، ہاں جو مقلد ان کے بعد وضوحِ دلیل کتاب و سنت کے تقلید رائے بحت پر جامد ہیں، ان کو خاطی سمجھتا ہوں، لیکن گمراہ بحت نہیں جانتا، نہ اُن کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتا ہوں، نہ معاذاللہ اُن کو کافر کہوں،

مسائل و عبادات و معاملات میں اختلاف اہلِ علم مکفر نہیں ہوتا ہے، غایۃ ما فی الباب یہ ہے کہ خطاء فی الاجتہاد یا خطاء فی الفہم ہو تو

جس کو علما پہچانتے ہیں ۔۔۔۔۔ اللہ سے امید کرتا ہوں کہ اگر قا...
فاعل اس خطا کا اپنے قصد میں مخلص غیر متعصب تھا ... دہ
تونی سے شبہ میں گرفتار ہوگیا تو وہ خطا اس کی معاف ہوجاوی،
اور اگر جمود اس خطا پر عمداً براہِ نفاق وشقاق خدا اور رسولؐ کے
ہے تو محل نہایت اندیشہ کا ہے، لیکن کسی مسلمان راجی خاتمہ...
نسبت ایسی بدگمانی کرنا کچھ ضروری نہیں ہے، نحن نحکم
بالظواھر واللہ اعلم بالسرائر[1]

نیز اس پُر آشوب زمانے میں جبکہ اسلام اور مسلمانوں پر ہر طرف سے فتنوں کی یورش اور مصائب کی یلغار ہے، ہمارے لئے اس سے زیادہ تباہ کن کوئی چیز نہیں ہے؟ کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ان فرعی مسائل پر دست وگریبان ہوں، اور ذرا ذرا سی باتوں پر ایک دوسرے کو کافر ومشرک اور ایک دوسرے کی نمازوں کو فاسد قرار دیں، تاریخ کے صفحات پر بکھرے ہوئے بیشمار واقعات ہمیں یہ سبق دینے کیلئے کافی ہیں کہ مسلمانوں کی شوکت وعظمت کے پرچم کسی دشمن نے سرنگوں نہیں کئے، بلکہ ہم نے خود آپس کی خانہ جنگیوں کے ذریعہ انھیں ایک ایک کرکے زیر کیا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی مسلمانوں میں فرعی مسائل پر معرکے گرم ہوئے ہیں ہمیشہ ان سے اسلام دشمن عناصر نے فائدہ اٹھایا ہے،

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں راہِ راست کی ہدایت عطا فرمائے، ہمیں حق کو حق سمجھنے اور اس کی اتباع کی توفیق بخشے، باطل کو باطل قرار دینے اور اس سے اجتناب کی ہمت عطا فرمائے، اور ہم آپس کی خانہ جنگیوں کے بجائے دین کے بلند مقاصد کے لئے اپنی زندگیاں خرچ کرسکیں، آمین ثم آمین، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ؛

---

[1] ماخوذ از ماہنامہ فاران مئی ۱۹۶۳ء بشکریہ ماہرالقادری صاحب مدیر فاران،

تصانیف

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

- آسان نیکیاں
- اندلس میں چند روز
- اسلام اور سیاست حاضرہ
- اسلام اور جدت پسندی
- اصلاحِ معاشرہ
- اصلاحی خطبات (۹ جلد)
- احکامِ اعتکاف
- اسلام اور جدید معیشت و تجارت
- اکابرِ دیوبند کیا تھے؟
- بائبل سے قرآن تک
- بائبل کیا ہے؟
- تراشے
- تقلید کی شرعی حیثیت
- جہانِ دیدہ (بیس ملکوں کا سفرنامہ)
- حضرتِ معاویہؓ اور تاریخی حقائق
- حجیتِ حدیث
- حضورؐ نے فرمایا (انتخاب حدیث)
- حکیم الامت کے سیاسی افکار
- درسِ ترمذی (۳ جلد)
- دینی مدارس کا نصاب و نظام
- ضبطِ ولادت
- عیسائیت کیا ہے؟
- علوم القرآن
- عدالتی فیصلے
- فرد کی اصلاح
- فقہی مقالات (۳ جلد)
- نقوشِ رفتگاں
- میرے والد۔ میرے شیخ
- ملکیتِ زمین اور اس کی تحدید
- مطابق سنت نماز بخوانید
- نقوشِ رفتگاں
- نفاذِ شریعت اور اس کے مسائل
- نمازیں سنت کے مطابق پڑھیے
- ہمارے عائلی مسائل
- ہمارا تعلیمی نظام
- ہمارا معاشی نظام
- تکملة فتح الملهم شرح صحیح مسلم ۶ جلد (عربی)
- ماهي النصرانية؟ (عربی)
- نظرة عابرة حول التعليم الإسلامي (عربی)
- أحكام الأوراق النقدية (عربی)
- بحوث في قضايا فقهية معاصرة (عربی)

The Authority of Sunnah.
The Rules of I'tikaf
What is Christianity?
Easy Good Deeds
Perform Salah Correctly.

فون ۵۰۴۲۲۸۰

مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴

پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰